ہفت روزہ

ندائے خلافت

۳۰/ مئی ۱۹۹۴ء

☆ داعیٔ تحریک کا دوسرا خطبۂ خلافت
☆ پاکستان کا بقا اور ڈاکٹر اسرار احمد... جوابِ آں غزل
☆ کراچی جل نہیں رہا' جلایا جا رہا ہے: ایک دُکھے دل کی فریاد

حدیثِ امروز

یہ انقلابِ چرخِ گردوں بے سبب تو نہیں

حج کا ایک اور اجتماع رواں ہجری سال کے اختتام کی تمہید بن گیا۔ اس کے شعائر میں سے ایک' یعنی قربانی کی عالمی توسیع نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو عیدالاضحیٰ کی مسرت دی جس میں بندے تین دن اپنے رب کے مہمان بن کر اُن چوپایوں کے گوشت سے کام و دہن کی تواضع کرتے ہیں جو اُسی کی عطا ہیں لیکن حج کے عالمی اجتماع سے وہ فوائد حاصل نہ ہوئے جن کا حصول اس کی اہم ترین غائت ہے اور جانوروں کی قربانی نے بھی مسلمانوں کو یاد نہ دلایا کہ یہ تو اس بات کی محض علامت ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے لئے ہم اپنے مال و جان سمیت ہر شے قربان کر دینے پر آمادہ ہیں۔ عرفات میں خطبۂ حج کے اختتامی حصے میں وہی دعائیں مانگی گئیں جو ہر سال خطیبِ حرم کے حلقوم سے بظاہر تڑپتی ہوئی نکلتی ہیں۔ اسلام کی سربلندی' مسلمانانِ عالم کی فوز و فلاح' اعدائے دین کی سرکوبی اور یہود و نصاریٰ کی تباہی و بربادی' بالخصوص یہود کے ناپاک وجود کا ملیا میٹ ہو جانا اور مسجد اقصیٰ کی باریابی لیکن یہ دعائیں رب العزت کی بارگاہ سے اب تک شرف قبولیت نہیں پا سکیں اور اس سال بھی آسمان تک شاید ہی رسائی حاصل کر سکیں' اندیشہ ہے کہ بادلوں میں ہی الجھ کر رہ جائیں گی اس لئے کہ ہم کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں۔ یہود و نصاریٰ کی سرپرستی پر دنیا کے مسلمانوں اور خاص طور پر عربوں کو اب اللہ تعالیٰ کی نصرت سے بھی زیادہ بھروسہ ہے اور جس اسرائیل کے بارے میں ہم چاہتے ہیں کہ اللہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے' اس کے بقا اور سلامتی کی عربوں نے ڈھکی چھپی ضمانت تو دے ہی رکھی تھی' اب کھلا اقرار نامہ بھی جاری ہونے ہی والا ہے۔ القدس کی جدائی میں آہیں بھرنے والوں نے ناجائز صیہونی ریاست کو عملاً تسلیم کر کے جواز کی سند دیتے ہوئے جو "معاہدۂ امن" کیا ہے اس میں یروشلم کی طرف کوئی ایک اشارہ بھی موجود نہیں!

حقوقِ انسانی کے باب میں تاریخ کے عظیم ترین چارٹر کا اعلان ہمارے نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع ہی کے موقع پر کیا تھا جن کے لئے آج کشمیر' بوسنیا' اریٹیریا' فلسطین اور سنکیانگ میں اُسیؐ کے امتی اقوامِ متحدہ کے حقوقِ انسانی کے نام نہاد کمیشن کے سامنے دست سوال دراز کرتے اور جھڑک دئے جاتے ہیں۔ یہ انقلابِ چرخِ گردوں بے سبب نہیں' دراصل ہمارے شعائرِ دینی اپنی روح سے تہی ہو چکے ہیں۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں' تو باقی نہیں ہے

قیمت ۶ روپے

دُکھتے ہوئے دِلوں کی فریاد یہ صدا ہے

کراچی جل نہیں رہا' جلایا جارہا ہے

اپنوں کا اندازِ حکومت غیروں کے طرزِ عمل سے بھی گیا گزرا نکلا

نجیب صدیقی

ہمارے ملک میں جتنے بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ "انداز حکمرانی" کا نتیجہ ہیں۔ سندھ و کراچی تو خصوصیت سے اس "انداز حکمرانی" کا شکار ہے۔ پولیس اور انتظامیہ میں جو لوگ ہیں عوام کے ساتھ ان کے سلوک کا انداز دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ غیر ملکی لوگ ہیں' اس علاقے کو انہوں نے فتح کیا ہے اور ہر قیمت پر یہاں اپنی حکمرانی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

انگریز نے اس ملک پر حکومت کی ہے یقیناً اس کا انداز جارہانہ تھا لیکن موجودہ دور کو دیکھتے ہوئے وہ دور "آئیڈیل" لگتا ہے۔ اس دور کی پولیس بھی سخت گیر تو تھی مگر تھی انتظامیہ کی گرفت میں۔ آج کی پولیس تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مادر پدر آزاد ہے جس سے نہ کسی کی عزت سلامت ہے نہ کسی کی آبرو۔ پولیس پر انتظامیہ کی کوئی گرفت نہیں جس کا ہر "ایکشن" قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ انگریز کے دور میں برا بھلا انصاف مل جاتا تھا' آج وہ بھی عنقا ہے۔ عدالت تک پہنچنے کے لئے آگ کے کتنے دریا پار کرنے پڑتے ہیں' یہ ان لوگوں سے پوچھئے جو بھگت رہے ہیں۔ مار کھانے' پٹنے بلکہ قتل ہونے کے بعد بھی ان کے معاملے کی انصاف کی دہلیز تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

انگریز کے دور میں قانون کی حکمرانی تھی' وہ فاتح قوم اپنے قانون کے دائرہ میں رہ کر حکومت کرتی تھی مگر آج قانون کے محافظ دن رات اپنے قوانین کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔ کوئی انگشت اٹھانے والا نہیں اور اگر کسی نے انگلی دکھائی تو وہ انگلی سلامت نہیں رہتی ہے۔ انگریز کے دور میں ایک بھی قتل ہو جاتا تو پوری انتظامیہ حرکت میں آجاتی تھی اور قاتل کا بچ کر نکل جانا انتظامیہ کی نالائقی میں شمار ہوتا تھا۔ پوری مشینری حرکت میں آجاتی تھی' یہ انتظامیہ کے وقار کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ آج انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح مسل دیئے جاتے ہیں' پرندوں کی طرح شکار کرلئے جاتے ہیں لیکن اصل قاتل گرفتار نہیں ہوتے' الٹے مقتولین کے ورثاء مزید عذاب میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں۔ بے گناہوں کو پھنسا کر اپنی جیبیں گرم کی جاتی ہیں۔

انگریز کے دور میں ڈکیتی انتظامیہ کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی' جس علاقے میں یہ واردات ہو جاتی' وہاں کی انتظامیہ لرز جاتی تھی۔ اب صرف کراچی کا اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے روزانہ درجنوں ڈکیتیاں چوریاں موٹر سائیکل اور کار چھننے کے واقعات رپورٹ ہوتے ہیں اور ساتھ ہی یہ خبر ہوتی ہے کہ کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ انتظامیہ کیا کرتی ہے؟۔ اس کے مشاغل کیا ہیں؟۔ وہ کن کاموں میں مصروف ہے؟۔ یہ وہ سوالات ہیں جو اس شہر کے بسنے والوں کے ذہن میں اٹھتے رہتے ہیں۔

انگریزوں کی عملداری میں اتنے بڑے پیمانے پر گرفتاریاں نہیں ہوتی تھیں لیکن اب مجرم ایک ہے تو گرفتار سو کئے جاتے ہیں۔ یہ "دھندا" بھی ایک "صنعت" کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ گرفتار ہونے والے "نمک مکا" کے بعد اپنے گھروں کو واپس ہوتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس آمدنی پر بھی "انکم ٹیکس" کا نفاذ ہو جانا چاہئے۔ جرم بے گناہی میں پکڑے جانے والے عموماً نوجوان ہوتے ہیں۔ پولیس کی مار اور لاک اپ کے عذاب سے چھٹکارا پانے کے بعد ان کے ذہنوں میں منفی سوچ ابھرتی ہے۔ پولیس اور انتظامیہ سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے اور بغاوت کے جذبات ذہنوں میں پرورش پاتے ہیں اور اس کا ایک منفی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ملک سے محبت کا گراف گر جاتا ہے۔

انگریز ایک غیر ملکی تھا' اس کے انداز حکمرانی نے وہ نفرتیں پیدا نہیں کیں جو چند برسوں میں اپنوں کی حکمرانی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔ موجودہ "جمہوریت کا عذاب" انگریزوں کے دور سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں خواہ یہ محسوس نہ کیا جاتا ہو' اہل کراچی تو اس عذاب کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ انگریزوں کے دور میں رشوت اور اقربا پروری کی شکایتیں تھیں مگر خال خال۔ اب آزادی اور جمہوریت کے اس دور میں تو یہ دونوں ڈنکے کی چوٹ پر ہوتی ہیں۔ اقربا پروری کے لئے کوٹے مقرر کئے گئے ہیں' یہ ایم۔ این۔ اے کا کوٹہ ہے' یہ ایم۔ پی۔ اے کا کوٹہ ہے اور یہ وزیر اعلیٰ کا کوٹہ ہے۔ انگریز کے دور میں داخلہ یا ملازمت میرٹ کے بنیاد پر دی جاتی تھی' جمہوریت کے دور میں اہل جمہور کے لئے یہ دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ کچھ مخصوص لوگ ہیں جن کی قسمت میں حکمرانی ہے' داخلے اور ملازمت انہی کے رحم و کرم پر ہیں۔ عوام الناس کو تو بس جمہوریت کا "کڑوا" پھل ملا ہے۔ ان کا استحصال' ان کے ساتھ بدسلوکی' انکے ساتھ ظلم' فلاح و بہبود کے نام پر جاری ہے۔

یقیناً یہ "دور عذاب" ہے۔ حکمران کہتے ہیں کہ جمہوریت پھل پھول رہی ہے۔ یہ کہاوت سنی تھی کہ روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا' اہل کراچی پر یہ مثال صادق آتی ہے۔ کراچی جل رہا ہے اور صدر سے لے کر وزراء و مشیر سبھی پر تکلف ڈنر اڑا رہے ہیں۔ جس شہر کے ہزاروں آدمی پس زنداں ہوں' وہاں لاکھوں گھر متاثر ہوتے ہیں۔ دلوں کی آگ نظر نہیں آتی مگر اپنے اندر ایک بڑا طوفان چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ حکمرانوں کا انداز حکمرانی یہ ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے' نہیں ہے تو ہو جائے گا۔

اس "دور عذاب" سے نجات کی کوئی صورت بھی ہے؟۔ یقیناً ہے۔ یہ دور عذاب ہم پر اس لئے آیا ہے کہ ہم نے اپنے رب سے کئے ہوئے عہد کو توڑ دیا ہے۔ جس مقصد کے لئے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا' ہم نے اس سے انحراف کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اگر ہم نے اس ملک میں جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا' اسلام کا نظام عدل اجتماعی اختیار و نافذ کیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ہم نے اپنے "حقوق" کے لئے

(باقی اندرونی سرورق کے دوسری جانب)

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور

جلد ۴ شمارہ ۲۲
۳۰/ مئی ۱۹۹۴ء

(10)

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ: -/۶ روپے
سالانہ زرِ تعاون (اندرون پاکستان) -/۱۲۵ روپے

زرِ تعاون برائے بیرونِ پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت	۱۳ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش	۱۰ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ	۱۶ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا	۲۰ " "

ایڈیٹر کے ڈیسک سے

عین آخری مرحلے میں یعنی جب لب بام دو چار ہاتھ رہ گیا تھا، ہمارے کمپوزنگ سیکشن کے پرنٹر نے جواب دے دیا اور تعطیلات کے باعث کوئی انتظام ہو نہ سکتا تھا لہٰذا ہم معاونین تحریک خلافت کو سطور ذیل میں تحریک کے اساسی مقاصد کی یاددہانی پر اکتفا کرتے ہیں حالانکہ کہنے کو بہت کچھ تھا۔ دل کی دل ہی میں رہی، بات نہ ہونے پائی۔ وسائل و اسباب پر بھروسہ تو نہیں، یہ معذرت تو ہے کی سمجھئے۔

تحریکِ خلافت پاکستان

کے اساسی مقاصد

۱۔ نبی اکرم ﷺ کی واضح پیشینگوئیوں کے مطابق پورے کرۂ ارض پر نظام خلافت کے قیام کی راہ ہموار کرنا۔

۲۔ نظامِ خلافت کی برکات سے پاکستان اور تمام دنیا کے مسلم و غیر مسلم افراد کو متعارف کروانا۔

۳۔ رائج الوقت غیر فطری، ظالمانہ اور استحصالی نظاموں کی گمراہیوں اور خرابیوں سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔

۴۔ مسلمانانِ عالم میں دین کے تقاضوں کا شعور پیدا کرنا۔

۵۔ ابتدائی مرحلہ کے طور پر پاکستان کے عوام کو ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا جہاں سے مذہبی فرقہ واریت اور انتخابی سیاست سے بالاتر ہو کر نظامِ خلافت کے قیام کے لئے منظم جدوجہد کی ضرورت کا شعور پیدا کیا جا سکے۔

الہدیٰ

سورۃ البقرہ
(آیت ۱۸۹)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لوگ تم سے پوچھتے ہیں چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے بارے میں'

(چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں سوال آنحضور ﷺ سے غالباً اس لئے کیا گیا کہ ہر دور میں اس کے حوالے سے طرح طرح کے اوہام و رسوم دنیا کی مختلف اقوام میں رائج رہے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ چاند کی کمی بیشی' اس کے طلوع و غروب اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے یا بعض تاریخوں کو نحس اور بعض کو سعد خیال کرنا' دوسری جاہل اقوام کی مانند اہل عرب میں بھی عام تھا اور اس بنیاد پر مختلف رسوم ان میں رائج تھیں۔ اس سوال کے ذریعے غالباً انہی باتوں کی وضاحت آنحضور ﷺ سے چاہی گئی تھی۔)

کہو کہ یہ لوگوں کے لئے اوقات کی تعیین کا ذریعہ ہے اور حج کے لئے ہے'

(کہ چاند کا گھٹنا بڑھنا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ تمہارے لئے تعیین اوقات کا ذریعہ ہے۔ یہ ایک قدرتی جنتری ہے جس کے ذریعے دنیا بھر کے لوگ اپنی تاریخوں کا حساب رکھتے ہیں' اور حج کی عبادت جس کی اہمیت عربوں کی مذہبی' تمدنی اور معاشی زندگی میں سب سے بڑھ کر تھی' تو بالخصوص قمری تاریخوں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ اہل عرب کے ہاں سال کے بارہ مہینوں میں سے چار حج اور عمرے سے وابستہ تھے' ان مہینوں کا خصوصی احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا' ان میں قتل و غارت گری سے اجتناب کیا جاتا تھا' قافلوں کی گزرگاہیں محفوظ ہوتی تھیں' چنانچہ تجارت کا فروغ انہی چار مہینوں میں ممکن ہوتا تھا۔)

اور یہ ہرگز کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو حدود الٰہی کو توڑنے سے بچے'

(کہ عربوں میں رائج توہم پرستانہ رسوم میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ جب وہ ایک بار حج کے لئے احرام باندھ لیتے اور حالت احرام ہی میں انہیں کسی ضرورت سے گھر جانا پڑتا تو وہ دروازے کے راستے اپنے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پشت کی طرف سے نقب لگا کر گھر میں داخل ہوتے اور اسے وہ بڑا اونچا نیکی کا عمل خیال کرتے تھے۔ ان کے اس جاہلانہ خیال کی پرزور تردید کر دی گئی اور صاف بتادیا گیا کہ یہ ہرگز کوئی نیکی کا کام نہیں ہے بلکہ درحقیقت نیکی اور تقویٰ کے معیار پر صرف وہ لوگ پورے اترتے ہیں جو اللہ کی قائم کردہ حدود کو ملحوظ رکھتے ہوں اور اللہ کی ناراضگی سے بچنے والے ہوں!)

اور آؤ اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح سے ہمکنار ہو سکو○

(لہٰذا اس احمقانہ رسم کو ترک کرو' اپنے گھروں میں سیدھے طریقے سے یعنی ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو' ہاں کرنے کا کام یہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اس کے احکام کو توڑنے سے گریز کرو' اس کی معین کردہ حدود کا لحاظ رکھو' یہ سب کچھ کرو گے تو فلاح و کامرانی کی امید رکھنے میں حق بجانب ہو گے' نیکی کے نام پر تمہاری یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں آخرت میں تمہارے کسی کام آسکیں گی!)

جوامع الکلم

اے لوگو' قربانی کرو اور جانوروں کا خون اخروی ثواب کی نیت سے بہاؤ۔ اس لئے کہ قربانی کے جانور کا خون اگرچہ زمین پر گرتا ہے لیکن فی الحقیقت اللہ کے خزانے میں چلا جاتا ہے

(کہ اخلاص نیت کے ساتھ کی گئی قربانی ہی اللہ کے ہاں مقبول ہوگی اور اس کے خون کا ایک ایک قطرہ اور اس کے جسم کا ایک ایک بال اس اعتبار سے اللہ کے خزانے میں محفوظ ہو جاتا ہے کہ بندۂ مومن کے لئے وہ دائمی اجر کا ذریعہ بن جائے گا)

(ترغیب بحوالہ طبرانی بروایت حضرت علیؓ)

(گزشتہ سے پیوستہ)

پہلے سالانہ کنونشن میں داعیٔ تحریک کا خطبۂ صدارت

تحریکِ خلافت پاکستان کے مقاصد کا دائرہ محدود ہے

انجمن، تنظیم اور تحریک ایک ہی حیاتیاتی اکائی کے تین اجزاء ہیں

مرتبہ: نثار احمد ملک

حزب التحریر کے بانی جناب تقی الدین نبہانی" اردن کے رہنے والے تھے جبکہ بعد میں انہیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ ان کا انتقال عراق اور اردن کے درمیان واقع پٹی میں قیام کے دوران ہوا جہاں کسی کی حکومت نہ تھی۔ انہوں نے ہی خلافت کا لفظ زندہ کیا ہے۔

حزب التحریر کے علاوہ امریکہ میں کچھ لبرل مسلمانوں نے اپنی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ ان تنظیموں کی توجہ یہودیوں کی سرگرمیوں کا کھوج لگانے پر مرکوز ہیں۔ یہ کوئی "فنڈامنٹلسٹ" لوگ نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے بھی اسی اصطلاح کو اختیار کیا ہے۔ یہ خالص لبرل حلقہ بھی اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ عالم اسلام کے تمام مسائل کا حل "نظام خلافت" کے قیام میں ہے۔

تیسری اور بہت اہم بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں احادیث مبارکہ کے مجموعوں کی جو ترتیب فقہی ابواب کی شکل میں ہے، وہ مسلمانوں کو بعض اہم حقائق سے دور کرنے کا سبب بنی ہے۔ اس ترتیب کے مطابق بہت سے اہم ابواب کتب احادیث کے آخر میں آتے ہیں۔ چنانچہ ایک بہت بڑے عالم دین نے صاف اقرار کیا کہ یہ حصے تو ہم مدارس میں پڑھاتے ہی نہیں ہیں۔ اس دور کے ایک بہت بڑے عالم دین علامہ ناصرالدین الالبانی نے جو شام کے رہنے والے ہیں، اس دور میں احادیث پر بہت کام کیا ہے۔ انہوں نے ایک نیا مجموعہ مرتب کیا ہے جو اس وقت کئی جلدوں میں چھپ بھی چکا ہے۔ اس مجموعہ کا نام "سلسلہ الاحادیث الصحیحہ" رکھا ہے۔ انہوں نے پہلے باب کا نام "المستقبل للاسلام" رکھا ہے اس باب میں انہوں نے وہ ساری احادیث جمع کی ہیں جن کا تعلق نظام خلافت کے دوبارہ احیاء سے ہے۔ اس سے لوگوں کی آنکھیں کھلی ہیں کہ یہ بہت بڑا خزانہ ہم سے اب تک کیوں پوشیدہ رہا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ ہم سے پہلے بھی لوگ خلافت کے حوالے سے کام کر رہے تھے۔ ہم نے جب اس آواز کو بلند کیا تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارے پاس پہلے سے ایک تنظیم موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ ادارہ یا تنظیم خواہ چھوٹی کیوں نہ ہو، ایک اکیلا اور دو گیارہ کا مصداق ہوتی ہے۔ اسی تنظیم کی وجہ سے ہم نے اس دعوت کو وسیع حلقے میں پھیلایا ہے۔ میں ان لوگوں کا بہرحال شکر گزار ہوں جن کے حوالے سے یہ اصطلاح ہم تک پہنچی ہے۔

انجمن تنظیم اور تحریک کا تعلق:- میں اس موقع پر انجمن خدام القرآن، تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کے باہمی تعلق کو بھی واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اس ضمن میں ایک تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ انہیں "Sister Organizations" کہہ کر بہت بڑا ظلم کرتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ تحریک کے لئے انجمن اور تنظیم "Parent Organizations" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے کہ تحریک انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے نتیجے میں برپا ہوئی ہے۔

ہم نے ان تینوں کے باہمی تعلق کے لئے ایک درخت کی تشبیہ قرآن حکیم سے اخذ کی ہے۔ سورۂ ابراہیم میں فرمایا گیا کہ "الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء" درخت کی ایک جڑ ہوتی ہے، اس کا ایک تنا ہوتا ہے اور پھر شاخیں ہوتی ہیں جو پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح درخت کی مثال حدیث مبارکہ میں بھی آئی ہے۔ حدیث مبارکہ حضرت معاذؓ سے مروی ہے۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اے معاذ! اگر چاہو تو اس دین کے اونچے عملوں میں جو چوٹی کا عمل ہے اور جو اس کی جڑ ہے، وہ تمہیں بتا دوں؟ انہوں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان! ضرور ارشاد فرمائیے: آپ نے فرمایا کہ جڑ کا عمل تو یہ ہے کہ تو اس کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، اور جس عمل سے دین کی گرفت مضبوط رہتی ہے، وہ نماز ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے اور اس کے اونچے عملوں میں سب سے چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ہم نے یہ تشبیہ قرآن و حدیث سے اخذ کی ہے۔ ہمارے اس کام میں انجمن خدام القرآن اور اس کے تحت دعوت رجوع القرآن اور تعلیم و تعلم قرآن کو جڑ کی حیثیت حاصل ہے جبکہ تنظیم اسلامی مضبوط تنا ہے۔ البتہ شاخوں کی حیثیت تحریک خلافت کو حاصل ہے، جن کا اصل وصف پھیلنا ہے۔

تحریک کے قیام کا مقصد:- یہ بات اچھی طرح واضح ہونی چاہئے کہ تحریک خلافت کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ یہ اس لئے ضروری ہے کہ جب یہ تینوں ادارے علیحدہ علیحدہ ہیں تو ان کے دائرہ کار کا بھی تعین ضروری ہے۔ تحریک کے مقاصد کا تعین ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم نے تحریک کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع کر لیا تو یہ بھی بہت بڑی غلطی ہو گی اور اگر اس کے اصل مقصد کا شعور نہ ہوا تو ہماری سعی و جہد بے نتیجہ رہے گی۔ اس تحریک کا مقصد صرف تبلیغ اور تعلیم ہے۔ اس کے تحت کوئی اقدام اور چیلنج نہیں ہو گا۔

تبلیغ کے دو درجے:- اس تعلیم و تبلیغ کی بھی دو سطحیں ہیں۔ پہلی سطح خالص علمی انداز میں خلافت سے متعلقہ شبہات کا ازالہ کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ

خلافت کا لفظ اور تصور ذہنوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ صدیوں کا فصل ہے' جس سے حقائق دھندلا گئے ہیں۔ تاریخ امت میں خلافت کے نام پر ملوکیت اور شہنشاہیت چلتی رہی ہے' جس نے خلافت کی اصل حقیقت کو مسخ کر دیا ہے۔ خلافت کے متعلق غلط تصورات کے جنگل کو خالص علمی سطح پر ہی صاف کیا جا سکتا ہے۔ علمی سطح پر ان تصورات کو واضح کرنا اتنا ضروری ہے کہ جو لوگ خلافت کے نام پر کام کر رہے ہیں' خود ان کے تصورات بھی واضح نہیں ہیں۔ چنانچہ اس ملک کے ایک بہت بڑے مفتی صاحب یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ خلافت یہی ہے کہ آپ مسلمان حکمرانوں کا ایک بورڈ قائم کر دیں اور ایک ایک سال کے لئے ان میں سے ایک کو خلیفہ بنا لیں گویا جہاں جو نظام ہے وہ برقرار رہے اور خلافت بھی قائم ہو جائے! اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ جب میں نے اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت پر گفتگو شروع کی تو مجھے کہا گیا کہ اس مسئلے کو تو آپ بالکل ہی نہ چھیڑیں۔ خلافت سے متعلق ایک اور موضوع یہ چھیڑ دیا گیا کہ یہ خلافت ہے کس کی! اللہ کی ہے' رسولؐ کی ہے یا مسلمانوں کی ہے؟ پھر حضرت آدمؑ جنوں کے خلیفہ بنائے گئے تھے یا انہیں اللہ کی خلافت دی گئی؟ اس موقع پر مجھے یاد آیا کہ دین اللہ کا بھی ہے اور محمدؐ کا بھی۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ "اللھم انصر من نصر دین محمد" قرآن میں آتا ہے "لکم دینکم ولی دین" یعنی تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔ اس کے علاوہ ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خلافت کا وہی نقشہ ہو گا جو چودہ سو سال پہلے تھا یا اس میں ہمیں حالات کے تقاضے کے تحت کوئی ترمیم کرنی ہو گی۔ دنیا میں پائے جانے والے تصورات میں سے کون سے صحیح ہیں جو ہمیں اختیار کرنے ہیں اور کون سے غلط ہیں جنہیں رد کرنا ہو گا۔ ان تمام شبہات کا ازالہ علمی سطح پر کرنا ہو گا۔ ہم نے خطبات خلافت کے ذریعے انہی سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔

تعلیم و تبلیغ کی دوسری سطح عوامی ہے۔ عوامی سطح پر آپ کو خلافت کی برکات بیان کرنی ہیں۔ عوام کے ذہنوں میں اسلام کا یہ تصور بٹھا دیا گیا ہے کہ اسلام آئے گا تو ہاتھ کٹیں گے' کوڑے لگیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ حدود و تعزیرات بھی نافذ ہوں گی لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ نظام خلافت عوام کو عطا کیا کچھ کرے گا۔ یہ کام جلسہ ہائے عام کے ذریعے آپ لوگوں کو کرنا ہے۔

نظام خلافت کیسے قائم ہو گا:- جس نظام خلافت کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ کیسے قائم ہو گا؟ اس ضمن میں دو باتیں بہت اہم ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اپنی ذات میں خلیفہ بنو گے تو نظام خلافت کے قیام کے لئے جد و جہد کر سکو گے ورنہ نہیں۔ اپنے وجود پر اللہ کا حکم نافذ کرنے سے آپ اپنی ذات میں خلیفہ ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے دائرہ اختیار میں اسی خلافت کو قائم کیجئے۔ سورۂ حدید میں آیا ہے کہ "مما جعل مستخلفین فیہ" تم سب کو اللہ نے کچھ نہ کچھ خلافت دے کر دنیا میں بھیجا ہے لہٰذا اپنے دائرہ اختیار میں خلافت قائم کرنا' نظام خلافت کے قیام کی طرف پہلا قدم ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ اس جد و جہد میں سمع و طاعت کی اہمیت ہم پر پوری طرح واضح ہونی چاہئے۔ آیت استخلاف سے پہلے اور بعد والی آیت میں سارا زور ہی اطاعت رسول پر دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور کی آیت نمبر ۵۴ میں فرمایا گیا "قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم وان تطیعوہ تھتدوا وما علی الرسول الا البلغ المبین" یعنی اے نبی کہہ دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور پھر اگر یہ رخ موڑ لیں تو جان لو کہ جو تمہارے اوپر ذمہ داری ہے اس کا سوال تم سے ہو گا اور جو رسول کی ذمہ داری ہے اس کا سوال اس سے ہو گا۔ دیکھو! اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور ہمارے رسول پر صاف صاف پہنچا دینے کے کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر آیت نمبر ۵۶ آتی ہے کہ "واقیموا الصلوہ واتوا الزکوہ واطیعوا الرسول لعلکم ترحمون" نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

رسول کی دو حیثیتیں:- اس اطاعت رسول کے بھی دو حصے ہیں۔ رسول کی اطاعت کا ایک حصہ رسول بحیثیت شارع ہے جبکہ دوسرا حصہ ہے رسول کی اطاعت بحیثیت امیر جماعت' بحیثیت سپہ سالار۔ ہمارے سامنے رسولؐ کی صرف ایک حیثیت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ رسولؐ ہمارے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ شریعت اسلامی کا پہلا ماخذ قرآن اور دوسرا رسولؐ کا حکم ہے۔ اس کے بعد اجماع اور قیاس آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت استخلاف سے پہلے اور بعد اطاعت رسول پر زور دیا گیا۔ اس لئے کہ اطاعت کے بغیر جد و جہد ہو ہی نہیں سکتی۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعہ" بعینہٖ یہی ترتیب سورۂ تغابن میں ہے۔ "فاتقوا اللہ ماستطعتم واسمعوا واطیعوا" تقویٰ اللہ کا اختیار کرنا ہے اور اطاعت رسولؐ کی۔ رسول' اللہ کا حکم بھی پہنچا رہے تھے اور یہ حکم پہنچانے میں ان کی حیثیت شارع کی ہے لیکن اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے جو جد و جہد ہو رہی تھی اس کی منصوبہ بندی حضور ﷺ اپنے اجتہاد اور تدبر سے بھی کیا کرتے تھے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ہر عمل اللہ کے حکم کے تحت ہو رہا تھا۔ اس سوچ اور رویہ سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک رسول کی حیثیت یہی ہے کہ ادھر سے پیغام آیا اور ادھر پہنچا دیا! حالانکہ حضورؐ کی زندگی میں ایسے کتنے ہی مرحلے آئے ہیں جہاں آپ نے اجتہاد کیا ہے۔

منافقین مدینہ کو آپؐ پر اعتراض ہی یہ تھا کہ آپ اللہ کا حکم آنے سے پہلے ہی جہاد و قتال کے لئے چل پڑے ہیں؟ اسی کا جواب سورۂ محمدؐ میں دیا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول کی اطاعت بحیثیت رسول ایک علیحدہ شے ہے اور رسول کی اطاعت بحیثیت امیر جماعت ایک علیحدہ شے ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اب بھی کوئی جد و جہد ہو گی تو اسی نہج پر ہو گی۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ اب نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہے لہٰذا کوئی رسول نہیں آئے گا اور نہ ہی کوئی قائد مرد کامل ہو گا۔ اب تو کوئی اللہ کا بندہ ہو گا جسے اللہ ہی اس کام کی توفیق عطا فرمائے گا۔ اس اللہ کے بندے کے ساتھ جڑنے سے پہلے دو باتوں کا اطمینان حاصل کر لیں۔ پہلی بات یہ دیکھ لیں کہ اس کی فکر درست ہے یا نہیں اور دوسری بات یہ کہ اس کی سیرت و کردار میں کوئی بڑا خلا تو نہیں۔ اس کے بعد جو تعلق اس کے ساتھ استوار کریں وہ ڈھیلا ڈھالا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ رشتہ بیعت سمع و طاعت کی بنیاد پر استوار ہو گا۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ کی اطاعت مسلمانوں پر فرض تھی لیکن آپ نے بیعت لے کر ہمیشہ کے لئے ایک سنت چھوڑی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

گر تو برا نہ مانے

پاکستان کا بقا اور ڈاکٹر اسرار احمد

قوم کو خبردار کرنے والے دوست ہیں یا دشمن!

انہوں نے جو کہا وہ تو یہاں اہلِ سیاست کا تکیۂ کلام ہے

اقتدار احمد

پچھلے شمارے میں ہم نے معاصر عزیز روزنامہ نوائے وقت کے ۸ مئی کے ادارتی صفحے سے اداریے سمیت تین چیزیں بلا کسی تغیر و تبدل کے نقل کی تھیں۔ اداریے کے جواب میں جو تحریر معاصر کو برائے اشاعت بھجوائی گئی وہ اب تک تو شائع نہیں ہوئی۔ تاہم امید ہے کہ جیسے تیسے جگہ پا ہی لے گی۔ اسے ہم اپنے قارئین کو پیش کرنے پر مجبور اس لئے ہیں کہ ہمارا اگلا شمارہ ظاہر ہے کہ بہت دیر بعد آئے گا۔۔۔۔ مدیر

۶ / مئی کو اپنے خطاب جمعہ میں ڈاکٹر اسرار احمد نے قوم کو خبردار کیا تھا کہ پاکستان کے خاتمے کے عمل کا گویا آغاز ہو چکا ہے اور اسے روکنا مقصود ہے تو ایک پانچ نکاتی لائحہ عمل کو بلا تاخیر اور بے چون و چرا اختیار کرنا ہوگا جس میں کتاب و سنت کی مکمل بالادستی' جوہری توانائی کا بھرپور استعمال' سود کا مکمل خاتمہ' صدارتی نظام کا نفاذ اور صوبوں کی تقسیم شامل ہیں۔ اس اہم تقریر کے پریس ریلیز کو لاہور کے سب ہی اخبارات نے کم و بیش شائع تو کیا ہے لیکن ادارتی سطح پر ردعمل کا اظہار صرف نوائے وقت نے کیا جو شدید تو ہے ہی' اس اعتبار سے غیر معمولی بھی تھا کہ بھرپور اداریے کے علاوہ اسی صفحے پر نظم و نثر کے دو اور اسالیب میں بھی ان باتوں کو ہدف بنایا گیا۔ ہمیں اس اعتراف میں ہرگز کوئی تامل نہیں کہ موقر معاصر کا یہ ردعمل بظاہر نہ صرف اس کے پختہ نظریات کے عین مطابق تھا بلکہ اس کے اپنے ماضی کی صحافتی روایات کی پوری عکاسی بھی کرتا ہے تاہم مقصد اگر محض تاؤ کھانا اور فتویٰ جڑ دینا نہیں بلکہ قارئین کی ذہنی تربیت ہے تو یہ توقع بھی بے جا نہیں کہ جس شرح و بسط کے ساتھ تنقید کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسی نسبت سے ہماری اس وضاحت کو بھی منظرعام پر آنے کا موقع دیا جائے گا اور ذاتی حوالوں کو بھی کم از کم اس قدر ضرور برداشت کر لیا جائے گا جس حد تک ان کا استعمال تنقید میں ہوا ہے۔

اولین توجہ طلب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے ایسی کون سی انوکھی بات کہہ دی ہے جو پہلے کبھی سنی نہ گئی ہو۔ یہ تو یہاں کے اہل سیاست اور دانشوروں کا تکیہ کلام ہے۔ "یہ کام نہ کیا گیا تو ملک کے ٹکڑے ہو جائیں گے"۔ "وہ نہ ہوا تو ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"۔ "فلاں پارٹی ملک توڑنے کے مشن کے ساتھ برسر اقتدار آئی ہے"۔ "ملک دولخت تو پہلے ہی ہو چکا ہے' اب اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کے ارادے ہیں" وغیرہ جیسے جملے ہمارے ہاں سیاسی بیانات کے محاورے اور روزمرہ میں شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ کہنے والے کی مراد حالات میں اپنی پسند کی اصلاح ہوتی ہے یعنی اس بات کی اہمیت جتانے کی غرض سے جو اس کے نزدیک ملک و قوم کی باوقار زندگی کے لئے ضروری ہے' ملک کے بقاء کو اس کے ساتھ مشروط کیا جاتا ہے اور عجب نہیں کہ کبھی نہ کبھی نوائے وقت نے بھی اپنے کسی اداریے میں یہی اسلوب اختیار کیا ہو جو ڈاکٹر اسرار احمد نے کیا ہے۔ دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں وہاں کے سیاستدان بالعموم اس طرح کی باتیں نہیں کرتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کہنے اور سننے والے سب جانتے ہیں کہ ان کے وطن کا وجود کسی خاص کام یا شخصیت کا مرہون منت نہیں' پہلے سے چلا آتا ہے اور آئندہ بھی برقرار رہے گا' فرق صرف اچھائی برائی میں کمی بیشی کا ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں "انذار" یعنی خبردار کرنے کے اس انداز پر کوئی بھی چونکتا نہیں تو اس لئے کہ اس قوم کے ساتھ یہ حادثہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے ہمارا نصف بہتر ہم سے علیحدہ ہو گیا اور بڑے ہی خون خرابے کے ساتھ علیحدہ ہوا۔ اس عمل میں ایک حددرجہ ذلت آمیز اور عبرتناک تاریخی شکست کا داغ ہماری پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بن کر رہ گیا جسے دھونے کا کام ابھی باقی ہے۔ پھر یہ بھی ہم عصر تاریخ میں پہلی بار ہوا کہ الگ ہونے والے حصے نے اپنے ملک کے نام تک کو ترک کر دیا۔ ذرا یاد کیجئے کہ خبردار کرنے والے "بدخواہوں" نے اس انجام بد سے بھی ہمیں ڈراتے ہوئے بقول آپ کے مایوسی اور انتشار پھیلا کر قوم اور ملک کے ساتھ سخت زیادتی کی تھی جبکہ قوم کے "خیرخواہ" راوی چین لکھتے رہے اور ہمارے دانشور صحافیوں کو مشرقی پاکستان میں محبت کے زمزمے بہتے دکھائی دیتے تھے لیکن آج تو ہم فیصلہ کر ہی سکتے ہیں کہ قوم کا غم کھانے والے حقیقت پسند کون لوگ تھے اور قوم کو میٹھی لوریاں دے کر خواب خرگوش کی "راحت" بہم پہنچانے والے کون!

ایک ضمنی پہلو اس معاملے کا یہ بھی ہے کہ پاکستان کے ٹوٹنے اور دنیا کے نقشے سے اس کے (خاکم بدہن) محو ہو جانے کی باتیں کرنے والے سیاستدانوں' تاجروں اور صنعتکاروں کی معتدبہ تعداد نے اپنے سارے انڈے اسی ایک ٹوکری میں نہیں رکھے' باہر بھی اچھے بھلے ٹھکانے بنا لئے ہیں اور اپنی کمائی کا ایک حصہ "آگے" بھیج دیا ہے جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد نے خود تو درویشی شعار کی' ان کے متعلقین کا بھی جو کچھ ہے' اسی ملک میں ہے۔ ان میں سے کسی کے پاس "گرین کارڈ" کا ہونا تو دور کی بات ہے' مڈل ایسٹ میں کوئی ملازمت یا چھوٹا موٹا کاروبار بھی موجود نہیں۔ زندگی گزارنے کا جو ڈھنگ (لائف سٹائل) ان لوگوں نے

اپنے گھروں میں اختیار کر رکھا ہے وہ اسی ملک میں چھوٹے چھوٹے جزیرے بنا کر رہتے تو برقرار رکھا جا سکتا ہے' کسی اور جگہ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ ان حضرات و خواتین کے مقابلے میں پاکستان کے کہیں زیادہ محتاج ہیں جو انگریزی محاورے کے مطابق جب روم میں ہوں تو وہی کچھ کر سکتے ہیں جو رومیوں کا شیوہ ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کا پاکستان کے خاتمے میں ہرگز کوئی مفاد نہیں اور جب وہ پاکستان کا مرثیہ پڑھتے ہیں تو وہ فی الحقیقت ان کے اپنے اور اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل پر ایک نوحہ ہوتا ہے۔

یہ نہ بھولئے کہ پاکستان نام کا کوئی ملک ۴۷ سال پہلے روئے زمین پر موجود نہ تھا۔ اس کا معجزانہ ظہور ایک خاص نظریاتی پس منظر میں ہوا' جو وجہ اس کے عالم وجود میں آنے کے سبب بنی وہی اس کی بقا کا جواز بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ پوری دنیا کے مسلم ممالک میں ایک علیحدہ شناخت اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس کے معاملے کو مسلمانوں کے کسی بھی اور وطن پر قیاس کرنا ہی غلط ہے جو نوائے وقت نے بھی کیا ہے۔ البتہ سوویت یونین نامی عظیم ملک کی مثال میں ہماری صورت حال سے مشابہت تلاش کی جا سکتی ہے۔ وہ بھی پون صدی پہلے ہی منصہ شہود پر ظاہر ہوا تھا اور اس کی بھی ایک نظریاتی اساس تھی جس کی شکست و ریخت کے نتیجے میں وہ عالی شان عمارت ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دھڑام سے زمیں بوس ہو گئی۔ آج روس بھی موجود ہے اور اس کی مقبوضہ یا ملحقہ درجن بھر ریاستیں بھی اپنے تاریخی و جغرافیائی ناموں کے ساتھ دنیا کے نقشے پر پھر سے نہ صرف نمودار ہو گئی ہیں بلکہ ابھرتی بھی نظر آ رہی ہیں لیکن یو ایس ایس آر عدم کے "بلیک ہول" میں غائب ہو گیا ہے۔ وہی یو ایس ایس آر جو عسکری قوت' جوہری ہتھیاروں' بین البراعظمی میزائلوں اور خلائی جنگ کی ٹکنالوجی میں امریکہ کے کان بھی کتر رہا تھا۔ اہل نظر بہت دنوں سے خبردار کر رہے تھے کہ داخلی کمزوریاں ایک دن اسے لے بیٹھیں گی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ بالآخر لے ہی بیٹھیں۔

ہم نے نوائے وقت اور ڈاکٹر اسرار احمد میں اس اختلاف رائے کی کنہ کو پہنچنے کی کوشش کی تو دونوں کے استدلال میں سب سے نمایاں فرق یہ نظر آیا کہ "فریم آف ریفرنس" بالکل مختلف ہے۔ ایک روز پہلے ہمارے پریس ریلیز کا جتنا کچھ حصہ خود اس اخبار میں شائع ہوا وہ بھی قرآن مجید کے تین متعین مقامات کے حوالوں سے مزین ہے جن میں متعلقہ آیات مبارکہ کا مفہوم تک بیان ہوا ہے۔ ایک مشہور اور متفق علیہ حدیث سے بھی استدلال اس میں پایا جاتا ہے لیکن نوائے وقت کے طویل اداریے میں کتاب و سنت کے ان حوالوں کی طرف یا قرآن و حدیث سے اس کے اپنے مؤقف کسی مقام کی جانب کوئی ایک اشارہ بھی موجود نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے حکمت قرآنی کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا' اخبار و آثار نبوی ؐ اور سیرت مطہرہ کو بطور عینک استعمال کیا اور حالات کے مشاہدے سے نتائج اخذ کرنے میں سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود اور موجودہ امت مسلمہ یعنی خود اپنی تاریخ کے تقابلی مطالعہ پر تکیہ کرنے کی عادت ڈالی ہے۔ علم و حکمت کے یہ سرچشمے ہماری رہنمائی ہی کے لئے ہیں' انہیں محض ایصال ثواب اور حمد و نعت میں تخیل کی بلند پروازی کے لئے تو محفوظ نہیں کیا گیا۔ قرآن مجید میں پچھلی امتوں اور بالخصوص بنی اسرائیل کے حالات دہرا دہرا کر جو بیان کئے گئے تو کیا اس لئے کہ یہ نعوذ باللہ قصے کہانیوں کی کوئی کتاب ہے؟۔ خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد کے سنگ ہائے میل پر جو سیر حاصل تبصرے قرآن کی محکم آیات اور ذخیرۂ احادیث میں پائے جاتے ہیں' ان کی غائت یہ نہیں تو پھر کیا ہے کہ امت مسلمہ ابدالآباد تک ان کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل طے کرے جس کے کاندھوں پر ختم نبوت کے بعد کار رسالت کی ذمہ داری کا بار گراں آن پڑا ہے اور اللہ کے رسول ؐ نے جو یہ فرمایا کہ بنی اسرائیل اور میری امت کا معاملہ ایسے مشابہ ہے جیسے ایک جوڑے میں ایک جوتا دوسرے جوتے کا معکوس عکس ہوتا ہے تو کیا اسی لئے نہیں کہ ہم ان حرکتوں سے باز رہیں جن کی پاداش میں یہود مغضوب علیہم قرار دیئے گئے ورنہ ہمارا حشر بھی انہی کی طرح برا ہو گا۔

ہماری درخواست بس اتنی ہے کہ صرف پولیٹیکل سائنس اور سٹیٹ کرافٹ کے مروجہ علوم اور بین الاقوامی حالات کے زیر و بم پر ہی بھروسہ نہ کیجئے' خدارا کبھی تو اپنا سراپا اس آئینے میں بھی دیکھئے جو اللہ اور اس کے رسول ؐ نے ہماری سہولت کے لئے مہیا کیا ہے۔ یہ الگ بات کہ اب تو اول الذکر بھی ہمارے حق میں نہیں جا رہے ہیں۔ سابقہ امت مسلمہ کے حالات پڑھنے سے کسی کو طبعی مناسبت نہ ہو تو ذرا اپنی تاریخ پر ہی ایک نظر ڈال دیکھے۔ ۹۳ھ میں مسلمان بیک وقت ہسپانیہ اور ہندوستان میں داخل ہوئے تھے' ادھر طارق بن زیاد ؒ کی کمان میں اور ادھر محمد بن قاسم ؒ کی زیر قیادت۔ ہسپانیہ سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹے پانچ سو دو برس بیت گئے ہیں تو کیا وہ اللہ میاں کے نعوذ باللہ سوتیلے تھے اور ہم سگے ہیں!۔ ان مسلمانوں کی اللہ تعالیٰ نے حفاظت نہ فرمائی تو کیا ہم ان سے بہتر مسلمان ہیں؟۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا باانداز معجزانہ عالم وجود میں آنا مشیت الٰہی کا خصوصی مظہر ہے اور عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تقویم میں اس خطہ ارضی کے لئے کوئی خاص کردار متعین ہو جس کی بنا پر پاکستان کو اب تک کسی نہ کسی شکل میں محفوظ رکھا گیا ہے ورنہ ہم نے اسے قصہ ماضی بنانے کی اپنی سی کوششوں میں اب تک کوئی کمی نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر خصوصی مہربانی فرما رہے ہیں جو ہماری کوششیں اب تک آدھا ملک کھو کر نصف کی حد تک ہی کامیاب ہو سکی ہیں۔ تاہم قرآن مجید میں بندوں کو صاف الفاظ میں خبردار بھی کیا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت کے بارے میں کسی دھوکے کا شکار نہ ہو جانا۔ وہ افراد اور اقوام کو مہلت ضرور دیتا ہے' ان کی رسی دراز بھی کر دیتا ہے لیکن پھر جب اس کی پکڑ آتی ہے تو اس کے جھٹکے سے پناہ بھی کہیں نہیں ملتی۔ ہماری دعا ہے کہ پروردگار ہم سے اپنی نگاہ کرم پھیر نہ لے اور ہمیں توفیق کی ارزانی فرمائے کہ اس کے غضب کو بھڑکانے سے باز آ جائیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ نوائے وقت نے اپنے اداریے میں اس فرد جرم کو تو پوری صراحت اور مکمل تفصیل کے ساتھ تسلیم کیا جو ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک اس قوم پر عائد ہوتی ہے لیکن نفاق کے اس عنوان کا ذکر نہیں کیا گیا جو کتاب و سنت میں ایسے جرائم کو دیا جاتا ہے۔ یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے اخبارات و جرائد میں ایک بحث چلی کہ ہماری قوم کا اصل المیہ کیا ہے اور دانشوروں نے اس حقیقت پر عمومی اتفاق کا اظہار کیا تھا کہ بدقسمتی سے ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر منافقت کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس قرارداد پر اتفاق نہ ہوتا تب بھی کیا یہ نوشتہ دیوار پڑھنے میں کچھ دشواری ہوتی ہے اور ہم میں سے ہر شخص کیا اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے نفاق کو شب و روز بھگت نہیں رہا؟۔ ہمارا اضافی قصور بس اتنا ہے کہ نفاق میں مبتلا ہونے کی وہ اصل وجہ بھی بیان کر دیتے ہیں جس کی طرف رہنمائی قرآن مجید سے بصراحت ملتی ہے کہ ہم اس عہد و پیمان سے پھر گئے جو اللہ کی جناب میں انگریز اور ہندو سے گلوخلاصی کی دعاؤں کی قبولیت کے

لئے ہم نے کیا تھا۔ اب ہم اس خدائی عقوبت سے خائف ہیں اور اپنے ہم وطنوں کو بھی اسی سے ڈرا رہے ہیں جو نفاق کی سزا کے طور پر بیان ہوئی جبکہ اس عقوبت کے وہ آثار ظاہر بھی ہونے لگے ہیں جو اسی کتاب ہدائت میں مذکور ہیں۔

جہاں تک نوائے وقت کے اس دعوے کا تعلق ہے کہ "یہاں نہ تو پارلیمانی نظام ناکام ہوا ہے اور نہ اسلام کا راستہ روکا گیا ہے" تو اس کے جواب میں ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ اسی پیرے میں آگے چل کر ان سب مفاسد کی فہرست درج کرنے کے بعد بھی جو ہماری سیاست میں در آئے ہیں' اگر آپ موجودہ نظام حکومت کو کامیابی کی سند عطا فرمارہے ہیں تو یہ ادائے دلبری آپ ہی کو مبارک ہو' جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ رہا مسئلہ اسلام کا راستہ روکنے یا نہ روکنے کا تو اس کا دارومدار اس سوال کے جواب پر ہے کہ اسلام سے آپ کی مراد کیا ہے۔ ایک اسلام تو وہ ہے جس پر علامہ اقبال نے پھبتی کسی تھی کہ "ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت' ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد" اور ایک اسلام وہ ہے جو اجتماعی زندگی کے بھی ہر گوشے کا احاطہ کرتا ہے۔ دور کی باتیں جانے دیجئے' قریب کا صرف یہی ایک واقعہ لے لیجئے کہ وفاقی شرعی عدالت کے حد درجہ جامع اور تاریخ ساز فیصلے کے بعد سود کی لعنت کو آپ کے معاشرے میں پہلے سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ سرائت کرنے کا موقع دیا جارہا ہے جبکہ نص قرآنی کے مطابق اس میں اضافہ نہیں' اس کا تسلسل بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے مترادف ہے۔ اس جادو کے بعد بھی جو اب سر چڑھ کر بول رہا ہے اسلام کا راستہ اگر نہیں رکا تو نہ جانے انتظار کون سی افتاد کا ہے!۔ پھر آپ کا یہ فرمانا کہ دنیا میں پانچ درجن کے قریب مسلمان ملکوں میں سے کسی میں اسلامی نظام کا ماڈل موجود نہیں جن میں سے کچھ باضابطہ طور پر اپنے آپ کو اسلامی بھی کہتے ہیں' ناواقف لوگوں کو تو اپیل کرے گا لیکن تحریک پاکستان کا پس منظر جاننے والوں کو اسے عذر لنگ کہتے بھی شرم آنی چاہئے۔ آپ کے اداریہ صفحہ میں روزانہ پورے التزام سے حضرت قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے فرمودات نقل کئے جاتے ہیں' ان کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچنے کے سوا بھی کوئی راستہ ہے کہ پاکستان کو عالم اسلام سمیت پوری دنیا کے سامنے اسلامی نظام کے ماڈل کے طور پر پیش کرنے کا اعلان اور عہد کیا گیا تھا۔

قوم اپنی اس ذمہ داری سے بچنا چاہتی ہے تو اب اس کی صرف ایک صورت ممکن ہے' یہ کہ ہم برملا اعتراف کریں کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح بس پوجا پاٹ کی رسوم کا ایک مجموعہ ہے ورنہ فرد اور اجتماعیت کے لئے اس کے پاس کوئی ضابطہ حیات موجود نہیں۔ کیا کوئی بدبخت اس اعلان کی ہمت رکھتا ہے؟۔

صدارتی نظام اور چھوٹے صوبوں کی مصلحت اب ایک گھسا پٹا موضوع ہے۔ اس کے حق میں ڈاکٹر اسرار احمد کے دلائل ہی نہیں' بہت سے دوسرے حلقوں کی طرف سے حمایت بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ "لوٹا" پارلیمانی نظام کی علامت بن گیا ہے اور سندھ کے مسئلہ کا حل صوبے کی تقسیم کے سوا کسی کے پاس ہے تو سامنے لائے جبکہ سندھ کی لسانی بنیاد پر تقسیم دوسرے صوبوں بالخصوص پنجاب کو بھی یکساں چھوٹے حصوں میں بانٹنے کے ایک "پیکج ڈیل" کے ساتھ تو ممکن ہے بصورت دیگر سندھ کو خون میں نہلا دے گی۔ بایں ہمہ یہ ایک سیاسی تدبیر ہے دین و اسلام کا مسئلہ نہیں اور اس سے بہتر کوئی تدبیر میسر آجائے تو ہماری تجویز اپنی موت آپ ہی مرجائے گی۔

اداریئے میں لطیف و کثیف پیرایوں میں ڈاکٹر اسرار احمد کی ذات پر مختلف حوالوں سے جو چوٹیں کی گئی ہیں' ان میں سے ایک ایک کا شافی جواب دیا جاسکتا ہے لیکن بات لمبی ہوجائے گی جو پہلے ہی خاصا طول کھینچ چکی ہے البتہ صرف ایک وضاحت ضروری ہے۔ آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ مسجد دارالسلام میں ڈاکٹر اسرار احمد کی سیاسی تقریر سننا لوگوں کی مجبوری بن جاتی ہے جو صرف فریضہ نماز کی ادائیگی کے لئے وہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ مسجد کسی آبادی میں واقع نہیں جبکہ ہر آبادی میں اس کی ضرورت سے زیادہ مساجد موجود ہیں۔ مسجد دارالسلام کے ساتھ دور دور تک گاڑیوں' موٹر سائیکلوں اور سکوٹروں کی جو لائنیں لگ جاتی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ بڑے بڑے فاصلے طے کرکے یہاں ڈاکٹر اسرار احمد کو سننے کے لئے آتے ہیں اور سب کو چونکہ معلوم ہے کہ ان کے خطاب کے آخری چند منٹ ہی سیاسی و ملی امور پر گفتگو کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور پہلا بڑا حصہ اسی تذکیر بالقرآن پر مشتمل ہوتا ہے جسے آپ وعظ کہتے ہیں لہٰذا مجمع اسی آخری وقت پورے جوبن پر آتا ہے۔ اہل لاہور بھولے نہیں ہوں گے کہ گزشتہ سے پیوستہ عید الفطر پر اخبارات کے ذریعے اعلان کر دیا گیا تھا کہ نماز کے بعد خطبہ میں ڈاکٹر صاحب کی ڈیڑھ گھنٹہ دورانیہ کی ایک تقریر بھی شامل ہوگی یعنی جسے واپسی کی جلدی ہو (اور عید کی نماز کے بعد جانے کی جلدی کسے نہیں ہوتی) وہ سوچ سمجھ کر ادھر کا رخ کرے۔ عید کا وہ اجتماع معمول سے زیادہ بڑا تھا اور محتاط اندازوں کے مطابق صرف پانچ فی صد حاضرین نماز سے فراغت کے بعد اور مزید پانچ فی صد آدھے گھنٹے کے بعد سے تقریر کے اختتام تک وقفوں میں اٹھ کر چلے گئے جبکہ نوے فیصد نمازیوں نے جم کر پوری تقریر سنی۔ نمازیوں کے ساتھ آپ کے اس اظہار ہمدردی کے بعد مسجد دارالسلام میں حاضری کم ہوجانی چاہئے تھی لیکن اگلے جمعہ بھی وہی پہلے والی کیفیت تھی۔○○

بقیہ: کشمیر

ہندوستان سے منقطع ہوکر زیادہ محفوظ رہنے کی بات وہ کیسے سوچ سکتے ہیں۔

اس طرح کے متضاد بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ جس طور پر پاکستان اور کشمیری امریکن کونسل کی جانب سے مسئلہ کشمیر سنبھالا جارہا ہے' اندر خانے ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔ جنیوا میں پاکستان کی مضحکہ خیز ناکامی اب قصہ ماضی بن چکی ہے۔ ہندوستان کشمیری پنڈتوں کا ایک وفد وہاں لایا تھا تو ہگرو کو بھی بھارتی مقبوضہ کشمیر سے آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ آزاد جموں کشمیر سے بھی ایک وفد آیا تھا جو وو شنگ سے تین روز پہلے ہی واپس چلا گیا۔ ہگرو نے مجھے بتایا کہ اگر انہیں پاکستان کی اس ڈرامہ بازی کا پہلے سے علم ہوتا تو وہ کبھی جنیوا کا رخ نہ کرتے جہاں انہوں نے بھارتی مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کی تھی۔

تو یہ سب کیا ہے؟۔ کیا پاکستان نے افغانستان سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جہاں مجاہدین اور پاکستان کی فوج میں ان کے حمائتیوں نے دوبارہ افغانستان کو جنگ میں دھکیل دیا ہے؟۔ ۹۰-۱۹۸۸ء میں اس مسئلے کو حل کرنے کے جو لوگ ذمہ دار تھے' وہ بعد میں مار کھا گئے۔

کشمیری مجاہدین نے مزاحمت کے میدان جنگ میں حیرت انگیز جرأت اور بہادری دکھائی ہے۔ افغانستان میں روسی فوج سوا لاکھ سے زیادہ نہ تھی اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے مقابلے میں وہاں کی آبادی بھی زیادہ تھی جبکہ کشمیری مجاہدین بہت کم تعداد میں ہونے کے باوجود چھ لاکھ بھارتی فوج کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر سیاسی زعماء کسی

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

مالاکنڈ میں نفاذ شریعت کے حق میں مظاہرہ اور دھرنا

یہ اسلامی تحریک کہیں "ہائی جیک" تو نہیں ہو گئی ہے؟

"ندائے خلافت" کے لئے محمد فہیم صاحب کی رپورٹ

ضلع دیر کے علاقہ میدان میں چند سال پہلے تحریک نفاذ شریعت ایک مقامی شخصیت صوفی محمد کے زیر قیادت شروع ہوئی۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے گزشتہ چار برسوں میں خاصی حرکت پیدا کی اور اپنی قوت کا پہلا عوامی مظاہرہ تمرگرہ کے مقام پر ۱۹۹۱ء میں کیا تھا۔ یہ مظاہرہ ضلعی ہیڈ کوارٹر تمرگرہ میں ہفتہ عشرہ سے زیادہ جاری رہا اور بالکل پر امن اور نہایت منظم تھا۔ تمرہ گرہ میں ضلعی کونسل کے پارک میں ان کا قیام رہا اور ہر روز سڑک پر مظاہرے کے بعد یہ لوگ سروں پر سیاہ کپڑے کی پگڑیاں باندھے واپس اپنے کیمپ پر جاکر ٹھہرتے تھے۔

بعد ازاں بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں یہ آواز تقریباً پورے مالاکنڈ ڈویژن میں یعنی دیر' سوات' بنیر' مالاکنڈ ایجنسی' چترال اور باجوڑ میں پہنچ گئی۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ صوفی محمد صاحب کی قیادت میں مختلف علاقوں سے لوگ مالاکنڈ کے مقام پر جمع ہوگئے ہیں اور انہوں نے راست اقدام کے طور پر مالاکنڈ میں بڑی سڑک کو بند کردیا ہے اور اس طرح مالاکنڈ ڈویژن (دیر سوات وغیرہ) کا سڑک کے ذریعے رابطہ صوبے اور پورے ملک سے منقطع کردیا ہے۔ اپنے مطالبہ نفاذ شریعت کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس مظاہرہ میں شریک ہیں۔

اس میں تو شک نہیں کہ یہ تحریک نہایت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ شروع کی گئی تھی اور اس کے داعی کے کردار پر بھی انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی تاہم یہ بات غور طلب ہے کہ تحریک نے اب جو رخ اختیار کیا ہے' وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب ایک ایسا رستہ اختیار کیا جارہا ہے جس میں اس تحریک کو نقصان پہنچنے کا زیادہ اندیشہ ہے۔

ہفتہ ۱۴ مئی کو تمرگرہ میں اچانک ٹریفک بائیں ہاتھ کے بجائے دائیں ہاتھ پر چلنی شروع ہوگئی اور ساتھ ہی یہ خبر تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی کہ شریعت محاذ کے مطالبہ کے نتیجے میں پہلا "اسلامی" کام یہ ہوا کہ پورے ملک کے معمول کے برعکس بائیں کے بجائے دائیں ہاتھ ٹریفک چلنے لگی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک کس رخ پر جارہی ہے اور اس کی ترجیحات کیا ہیں!۔

تحریک کا ایک شاہراہ کو بند کرنا بھی اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ اسے ایک غلط رخ پر لگانے کے لئے تحریک میں ایسے لوگ در آئے ہیں جو شریعت کی آڑ میں کسی اور مقصد کے لئے کوشاں ہیں۔ مثلاً ایسے لوگوں کو بھی پیش پیش دیکھا گیا ہے جو خود سمگلنگ' بلیک مارکیٹنگ اور لوٹ مار وغیرہ جیسے قبیح غیر شرعی دھندوں میں مصروف ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے مالاکنڈ ڈویژن سے PATA (جو پروونشل ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریا کا مخفف ہے یعنی صوبے کے زیر انتظام قبائلی علاقہ) کے مخصوص قوانین کو ختم کرکے ملک کے عام قانون کا نفاذ کرنا چاہا ہے اور بہت سے ایسے عناصر جن کے مفادات "پاٹا" ریگولیشن کے ساتھ وابستہ تھے' اب اس تحریک کی آڑ میں سول لاء کے نفاذ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس پس منظر میں معاملہ اب ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آتا دکھائی دیتا ہے جو نفاذ شریعت سے زیادہ کچھ اور چاہتے ہیں۔ صوفی صاحب اور ان کے ساتھی خواہ کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں' اب محسوس ایسا ہوتا ہے کہ یہ تحریک ہائی جیک ہو رہی ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ خدشات درست ہوئے تو ایک آواز جو نہایت خلوص کے ساتھ بلند ہوئی تھی' شاید کوئی خیر برآمد کئے بغیر دبادی جائے۔

دراصل تحریک کے قائدین نے ان اصولوں اور تدریج کو مدنظر نہیں رکھا جو ایک اسلامی تحریک کے لئے اقدام سے پہلے درجہ بدرجہ اپنانے ضروری ہیں' یعنی تربیت' تنظیم اور نہی عن المنکر باللسان۔ یہ بات بھی محل نظر ہے کہ کوئی ایسی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو بھی سکے گی جو شریعت کا نفاذ سارے ملک کو چھوڑ کر صرف ایک چھوٹے سے علاقے (مالاکنڈ ڈویژن) میں کرانے کے مطالبے کے ساتھ اٹھی ہے۔

دیکھنا یہ بھی ہے کہ تحریک کے اکابرین اپنے اصولوں پر کس حد تک کاربند رہ کر صحیح نہج پر کام کرتے ہیں تاکہ یہ تحریک مرحلہ وار آگے بڑھے۔ موجودہ کیفیت بہرحال کچھ زیادہ اطمینان بخش معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ تحریک کی قیادت کے لئے تربیت یافتہ لوگوں کی کوئی ٹیم ہراول دستے کے طور پر موجود نہیں' بس ایک جذبہ ہے جس نے عوام الناس کو جوش دلادیا ہے۔ ساتھ ہی یہ حکومت وقت کا بھی امتحان ہے کہ وہ اس مسئلہ کو کیسے نمٹاتی ہے---- اگر حکومت اور تحریک دونوں نے سنجیدگی اور ہوشیاری کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش صحیح خطوط پر نہ کی تو ہوسکتا ہے کہ انتشار اور غیر یقینی کی سی صورت حال برقرار رہنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تمام متعلقین کو صحیح نہج پر سوچنے سمجھنے اور حل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔OO

اور جامع اخباری اطلاعات

۱۷/ مئی کے روزنامہ "پاکستان" لاہور کی تفصیلی خبر

پشاور (اپ پ / نمائندہ خصوصی) مالاکنڈ ڈویژن کے ضلع بونیر میں شرعی قوانین کے نفاذ کے لئے جلوس پر پولیس اور پیرا ملٹری دستوں کی فائرنگ سے کم از کم ۱۳ افراد ہلاک اور ۲۹ زخمی ہوگئے۔ یہاں پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق بونیر ضلع کے علاقہ ڈوگر کے لوگوں نے جن میں پولیس بھی شامل تھی گزشتہ روز تحریک نفاذ شریعت کی

حمایت میں جلوس نکالا اور بونیر مردان روڈ پر پہنچ گئے۔ شرکائے جلوس جب امیلا کے قریب بابا جی کنڈاؤ کے قریب پہنچے تو انہیں منتشر ہونے کو کہا گیا۔ لیکن انہوں نے منتشر ہونے کی بجائے پولیس اور پیرا ملٹری دستوں پر پتھراؤ شروع کر دیا جس سے فرنٹیئر کانسٹیبلری کے دو جوان اور ایک پولیس کانسٹیبل زخمی ہو گیا۔ اس دوران جلوس میں بعض شرپسندوں نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ارکان پر فائرنگ شروع کر دی۔ جس سے قانون نافذ کرنے والی فورسز کو مجبوراً اپنے تحفظ کی خاطر جوابی کارروائی کرنا پڑی۔ جس سے طلباء سمیت ۱۰ افراد ہلاک اور ۲۹ زخمی ہو گئے۔ جنہیں علاج کے لئے ڈگر ہسپتال میں پہنچا دیا گیا ہے زخمیوں میں فرنٹیئر کانسٹبلری کے دو جوان اور پولیس والے بھی شامل ہیں پولیس رپورٹ کے مطابق علاقہ میں حالات معمول پر آ گئے ہیں۔ واضح رہے کہ چند روز قبل ۲۰ ہزار سے زیادہ قبائلیوں نے مالاکنڈ ڈویژن میں اپنے اس مطالبے پر زور دینے کے لئے ایک پہاڑی راستہ کو بند کر دیا کہ علاقے میں اسلامی قانون نافذ کیا جائے۔ مظاہرین نے درہ مالاکنڈ بھی بند کر دیا تھا۔ یہ درہ شمالی علاقے کو باقی ملک سے ملانے کا اہم ترین راستہ ہے۔ مظاہرین شمال کے ۵ اضلاع میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وائس آف امریکہ کے مطابق یہاں کے لوگوں کو خوف ہے کہ سپریم کورٹ کے ایک حالیہ فیصلے کی بناء پر وہاں سول لاز نافذ کئے جائیں گے۔ امریکی ریڈیو کا کہنا ہے کہ سرحد میں آفتاب احمد خان شیرپاؤ اور حزب اختلاف کے درمیان باقاعدہ طاقت آزمائی کے لئے جمعرات کا دن مقرر ہوا ہے مگر اس سے قبل حکومت کو مالاکنڈ ڈویژن میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی اس تحریک سے نمٹنا ہے۔ اس تحریک کی وجہ سے سرحد کے ۵ شمالی اضلاع باقی ملک سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ گزشتہ روز ہزاروں لوگ مردان سے مالاکنڈ جانے والی شاہراہ پر دھرنا مار کر بیٹھے رہے۔ اور ان کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ جب تک مالاکنڈ ڈویژن میں شریعت کے نفاذ کا صدارتی فرمان جاری نہیں ہوتا وہ واپس نہیں جائیں گے۔ مظاہرین نے اپنی قوت اور مروجہ قوانین کی نافرمانی کے اظہار کے طور پر سڑک کے بائیں طرف چلنے کا ضابطہ بدل کر موٹر گاڑیوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ دائیں طرف چلیں اور اس وجہ سے کئی حادثات ہوئے ہیں۔ وائس آف امریکہ کے مطابق اس وقت مالاکنڈ ڈویژن میں کوئی نظام نہیں ہے اور ایک خلا کی سی کیفیت موجود ہے۔ قبائلی ۱۱ مئی سے مسلسل احتجاج کر رہے ہیں ہزاروں افراد مختلف علاقوں سے قافلوں کی صورت میں آئے اور بٹ خیلہ سے لے کر چڑا تک ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے میں سڑک پر خیمہ زن ہو گئے۔ مظاہرین کی تعداد ڈیڑھ لاکھ بتائی گئی ہے۔ راستے بند ہونے کے باعث مالاکنڈ ڈویژن میں ضروری اشیاء مہنگی ہو گئی ہیں اور اناج کی قلت کا خطرہ ہے۔ مالاکنڈ جرگے کے سربراہ خواجہ محمد نے کہا ہے کہ صدر لغاری امریکہ کا دورہ ملتوی کر کے اس اہم قومی مسئلے پر توجہ دیں۔ دریں اثناء نیم فوجی دستوں نے بٹ خیلہ کے آس پاس پوزیشن سنبھال لی ہے۔ مگر فی الحال کسی تصادم کا کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ مظاہرین بھی جدید ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ پشاور میں مبصرین کا کہنا ہے کہ حکومت کو صوبائی اسمبلی میں طاقت آزمائی کا مرحلہ درپیش ہے اس لئے ان کو مالاکنڈ کے نمائندوں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ دریں اثناء مسلم لیگ نواز گروپ اور جے یو آئی سمیع الحق گروپ نے مظاہرین کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ مبصرین کہتے ہیں کہ صوبائی اسمبلی کا جو اجلاس جمعرات کو طلب کیا گیا ہے اس میں اکثریت ظاہر کرنے کی غرض سے شیرپاؤ حکومت کو پاکستان اسلامی فرنٹ کی حمایت درکار ہے۔ مگر فرنٹ کے ارکان فی الحال حکومت اور اپوزیشن کی لڑائی میں غیر جانبدار رہنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ جمعرات کو صبح کے اجلاس میں نیا ڈپٹی سپیکر منتخب کیا جائے گا اور شام کے اجلاس میں اے این پی کے سپیکر ہدایت اللہ چمکنی کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پر رائے شماری ہوگی۔

بی بی سی کے مطابق قبائلی اصل مقام سے ۵۰ میل دور بونیر ضلع کی اہم شاہراہ کو بھی بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سکیورٹی افواج کی فائرنگ سے زخمی ہونے والے ۲۹ افراد میں سے چار کی حالت نازک ہے۔ حکام کا کہنا ہے کہ مظاہرین کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ وہ اس اہم شاہراہ کو بند نہ کریں مگر مظاہرین جو مسلح تھے انہوں نے ہدایات پر عمل نہ کرتے ہوئے گولی چلادی۔ ادھر مالاکنڈ ڈویژن میں افواج کو تیار رہنے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ بی بی سی کے مطابق صحافیوں کی ایک جماعت جو بٹ خیلا کا دورہ کر کے واپس آئی نے کہا ہے کہ احتجاج ختم ہونے کے بہت کم آثار ہیں اگرچہ حکومت قبائلی رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات بھی کر رہی ہے جس کا نعرہ ہے شریعت یا شہادت۔ تنظیم کے رہنما مولانا صوفی محمد نے کہا جب سے سپریم کورٹ نے قبائلی قوانین ختم کئے ہیں اس وقت سے قبائلی علاقوں کی صوبائی انتظامیہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر پاکستانی حکومت اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی ہے۔ چونکہ ان مطالبات کو مان کر قوانین کو تبدیل کرنا ہوگا جس کے لئے وہ تیار نہیں۔ اگر مظاہرین کو منتشر کرنے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ حکام کا خیال ہے کہ کیونکہ عید قریب آرہی ہے قبائلی احتجاج ختم کرنے کے لئے خود مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن دورہ کرنے والے صحافی اسے حکام کی محض خوش فہمی تصور کرتے ہیں۔

اسی دن روزنامہ جنگ

لاہور کی اطلاع

پشاور (اے پی پی) صوبہ سرحد کے گورنر میجر جنرل (ریٹائرڈ) خورشید علی خان نے ایک حکم کے ذریعے پاٹا ریگولیشن کے خاتمے کے بعد مالاکنڈ ڈویژن میں اسلامی شرعی قوانین نافذ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری اقدامات فوری طور پر کئے جا رہے ہیں۔

اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم پر مشتمل

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دس خطبات کا مجموعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبیؐ کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے رہنما خطوط

صفحات ۳۸۴ ● قیمت: اشاعت خاص (مجلد) -/۶۰ ، اشاعت عام -/۳۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن

داعیٔ تحریک ڈاکٹر اسرار احمد کے دوسرے خطبۂ خلافت کی دوسری قسط

مرتبہ: نثار احمد ملک

مجوزہ نظامِ خلافت کا "سٹیٹ کرافٹ"

خلافت سے مناسبت میں صدارتی اور پارلیمانی نظام حکومت کا موازنہ

اب ہمیں اجتماعی نظام پر بات کرنی ہے۔ انسانی اجتماعیت کے اندر مختلف stages ہیں جن کی ایک ترتیب تاریخی بھی ہے اور اہمیت کے اعتبار سے بھی' اس کے علاوہ ایک ترتیب قرآن اور دین کے حوالے سے بھی ہے۔

انسانی اجتماعیت کا پہلا قدم ایک مرد اور عورت کے درمیان رشتہ ازدواج ہے۔ ایک مرد اور عورت کے اس رشتے سے ایک خاندان وجود میں آیا۔ اس سے آگے اولاد ہوئی جس سے یہ خاندان کا سلسلہ وسیع ہوا اور معاشرہ وجود میں آیا۔ گویا اجتماعیت کا پہلا قدم عائلی و معاشرتی نظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں اجتماعیت کے دوسرے گوشوں کی نسبت عائلی نظام کے بارے میں بڑے تفصیلی احکامات دیئے گئے ہیں' اس لئے کہ اگر پہلی اینٹ صحیح رکھی جائے گی تو پوری عمارت اوپر تک صحیح جائے گی۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو گیا تو پھر بقول شاعر۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

قرآن حکیم میں سیاسی اور معاشی نظام کا کوئی ڈھانچہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں سیاسی نظام کے صرف اصول دیئے گئے ہیں جبکہ معاشی نظام کے کچھ اصول بھی دیئے گئے ہیں اور کچھ احکام بھی موجود ہیں۔ گویا قرآن حکیم کی ترتیب میں اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت عائلی اور خاندانی نظام کو حاصل ہے جبکہ عہد حاضر میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو گیا ہے۔ آج کی دنیا میں اہم ترین' سیاسی و دستوری ڈھانچہ ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ دستور میں طے ہو جائے گا گاڑی اسی کے مطابق چلے گی۔ دستور کے اندر اگر یہ طے کر دیا جائے کہ یہاں کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے منافی نہیں ہو سکتی تو ایسی صورت میں آپ عائلی قوانین کو بھی چیلنج کر سکتے ہیں۔ گویا عہد حاضر میں پورے معاشرتی نظام کو کنٹرول کرنے والی چیز دستور ہے۔

اس حوالے سے ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان میں دستور کے حوالے سے controvercy چل رہی تھی۔ اس وقت کے وزیر قانون جناب اے۔کے بروہی مرحوم کہیں کہہ بیٹھے کہ جو شخص یہ ثابت کر دے کہ قرآن حکیم میں دستوری خاکہ موجود ہے' اسے میں ایک ہزار روپے انعام دوں گا۔ ان کی بات ایک اعتبار سے صحیح تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی تفصیلی دستوری خاکہ قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے تو صرف اصول دیئے ہیں۔ قرآن نے نہ ہی صدارتی نظام دیا ہے نہ پارلیمانی' نہ ہی وفاقی نظام دیا ہے اور نہ وحدانی نظام کی طرف رہنمائی کی ہے۔ بروہی صاحب کی بات اس حوالے سے صحیح تھی لیکن وہ سیاسی دباؤ کی وجہ سے اپنی بات پر قائم نہ رہ سکے۔ قرآن حکیم نے ان باتوں کو کھلا چھوڑا ہے۔

دوسری اہم بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک تعلق ہے ریاست کے پورے نظام کا کہ ریاست کے ارکان کون کون سے ہیں؟ ان کے آپس میں حقوق و فرائض کیا ہیں۔ نیز تحدید و توازن کا پورا نظام کیسے وجود میں آتا ہے؟ اس سب کا مجموعی نام State Craft ہے۔ ریاست کا یہ تفصیلی ڈھانچہ ہمیں خلافت راشدہ میں بھی ابتدائی صورت میں ملے گا اور نہ دنیا میں یہ پورا ڈھانچہ حقیقتاً بعد میں وجود میں آیا ہے۔ بعض حقائق کو جرات کے ساتھ تسلیم کر لینے سے ہی بات آگے چلے گی۔ جب خلافت راشدہ کا عہد ختم ہوا تو اس وقت یہ امتیاز کہیں موجود ہی نہ تھا کہ یہ انتظامیہ ہے' یہ مقننہ ہے اور یہ عدلیہ ہے۔ خلافت راشدہ میں یہ اصول تھا کہ اگر خلیفہ غلط راستے پر چلے تو اسے روکا جائے۔ اب کیسے روکا جائے؟ اس کا کوئی معین راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب بیعت خلافت لی تو اسی وقت اعلان کر دیا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو تم پر میری اطاعت فرض ہے اور اگر ٹیڑھا ہونے لگوں تو مجھے سیدھا کرنا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ آپ نے ایک دفعہ مسلمانوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے سوال کیا کہ اگر میں سیدھا چلوں' صحیح حکم دوں تو تم کیا کرو گے؟۔ اس پر سب نے کہا "نسمع و نطیع" اس کے بعد پھر سوال کیا کہ اگر میں کوئی غلط راستہ اختیار کروں تو کیا کرو گے؟ اس پر ایک شخص مجمع میں سے کھڑا ہو گیا اور اس نے تلوار نیام سے باہر نکال لی اور کہا کہ تمہیں اس سے سیدھا کریں گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے اردگرد کوئی اندھی بہری بھیڑ نہیں ہے جس کو میں لے کر چل رہا ہوں بلکہ زندہ اور ہوش مند لوگ ہیں۔ وہی بات جو قرآن میں حضور ﷺ سے کہلوائی گئی کہ "قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرہ انا و من اتبعنی" اے نبی کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے' میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں' میں بھی اور جو میرے ساتھی ہیں وہ بھی' یہ بلانا پوری بصیرت کے ساتھ ہے۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ خلافت راشدہ کے بعد دینی اعتبار سے ہم مسلسل زوال کی طرف گئے ہیں۔ بنو امیہ کے ۹۰ برس ہیں جن کے دوران میں رفتہ رفتہ خلافت راشدہ کے اوصاف ختم ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے بعد بنو عباس کا دور شروع ہوا جس میں ملوکیت اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی۔ دینی اعتبار سے تو زوال سے دوچار ہوئے لیکن دنیاوی' تمدنی و تہذیبی اعتبار سے' علمی و فنی اعتبار سے ایک ہزار برس تک مسلمانوں نے دنیا کی امامت کی ہے۔ ان دونوں باتوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام گرتا جا رہا ہے' مسلمان نہیں گر رہا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس بلندی پر پہنچایا تھا وہاں سے گرتے گرتے بھی دنیاوی اعتبار سے غلبہ مسلمانوں کے پاس موجود رہا ہے۔ بقول شاعر۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو تب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

عالم اسلام علوم و فنون کی معراج کو پہنچا ہوا تھا جبکہ یورپ اس وقت سویا ہوا تھا۔ وہ خود اس دور کو "Dark ages" کہتے ہیں۔ سائنس اور فلسفہ پڑھنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ کسی کے گھر سے اگر سائنس و فلسفہ کی کوئی کتاب بر آمد ہو جاتی تو اسے زندہ جلا دیا جاتا۔ اس سے وہاں کی ظلمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ گویا ہزار برس تک مسلمانوں کا دبدبہ موجود رہا۔ یہ ضرور ہوتا رہا کہ ادھر کچھ غروب ہوگیا تو دوسری طرف طلوع ہوگیا۔ ہسپانیہ سے مسلمانوں کا خاتمہ ہوا تو مشرق سے ترک یورپ میں داخل ہوگئے۔۔

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے' ادھر نکلے' ادھر ڈوبے ادھر نکلے

مسلمانوں کی یہ حالت کم و بیش ایک ہزار سال تک رہی لیکن اس کے بعد ہمارے تین سو برس غفلت کی نیند سوجانے کے ہیں۔ یورپ کو ہم نے ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے بیدار کردیا اور خود سوگئے۔ یورپ کو علم' ہنر' فلسفہ' سائنس اور منطق ہم نے سکھائے ہیں۔ اٹلی' فرانس اور جرمنی سے نوجوان اسی طرح چل کر غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں آتا تھا جیسے آج کا ہمارا نوجوان یورپ اور امریکہ جاتا ہے۔ اس کے بعد کا علمی و تہذیبی ارتقاء کل کا کل وہاں ہوا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "Give the devil his due" یعنی شیطان کو بھی اس کا جائز حق دینا ضروری ہے۔ بمصداق الفاظ قرآنی "ولا یجرمنکم شنان قوم الا تعدلوا اعدلوا ھواقرب للتقوی" چنانچہ یہ بات تو ہر انسان جانتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ارتقاء مغرب میں ہوا ہے۔ یہ بجلی کسی مسلمان نے تو ایجاد نہیں کی۔ اسی طرح یہ لاؤڈ اسپیکر' سٹیم انجن ہوائی جہاز' وائرلیس' یہ ساری ترقی یورپ ہی میں تو ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ ان کے باپ کی جائیداد نہیں ہے بلکہ نوع انسانی کو مشترک میراث ہے۔ ہمارا بھی اس پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ان کا ہے۔ حضور ﷺ کے ایک قول مبارک کے مطابق ہمارا حق زیادہ ہے۔ آپ نے فرمایا: الحکمہ ضالہ المومن ھو احق بھا حیث وجدھا" حکمت تو مومن کی گم شدہ متاع ہے اور وہ اس کا زیادہ حقدار ہے جہاں بھی پائے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ انگریزوں کی ایجاد ہے لہٰذا ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اگر ہم یہ طے کرلیں گے کہ غیروں کی کوئی چیز بھی استعمال نہیں کریں گے تو ہم اپنے پاؤں پر کلہاڑا ماریں گے۔ ہماری اس روش سے ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

یورپ اور مغرب کی سائنسی ترقی کے اعتراف کے ساتھ ایک دوسری چیز بھی ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے تو انسانیت کو وہ نظام دیا جس سے زیادہ عوامی حقوق والا نظام دنیا میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں گاندھی اپنے وزراء کو ابوبکرؓ کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کر رہا ہے۔ گویا کہ "جادو وہ جو سرچڑھ کر بولے" ------ لیکن اس کے بعد ہم نے محل سجائے اور عیاشیاں شروع کیں۔ علامہ اقبال اپنی اسی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس سے کہلوا رہے ہیں کہ۔

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں

ہم سو گئے لیکن یورپ نے پھر خون دیا ہے۔ فرانسیسیوں نے اپنے خون سے ملوکیت کا خاتمہ کیا اور جمہوریت لائے۔ انسانی حقوق کا تصور دوبارہ اجاگر کیا۔ یہ انسانی حقوق کا تصور ہم نے دیا تھا لیکن اس سے ہم خود ہی محروم ہوگئے۔ بقول اقبال۔

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو
زاں کہ از خاکش بروید آرزو
یاز نور مصطفیٰ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ ست

اس معاملے میں بھی ہمیں یورپ کا احسان مند ہونا چاہئے کہ انہوں نے ریاست کی پوری مشینری ایجاد کی ہے۔ یہ اصول بھی انہوں نے ہی دیا ہے کہ ریاست کے تین گوشے مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ ہیں۔ یہ کام بھی ہم نے نہیں کیا ہے۔ جس طرح ہم ان کی سائنسی ایجاد کی نفی نہیں کرتے بلکہ استفادہ کرتے ہیں بالکل اسی طرح ہمیں ان چیزوں کی بھی نفی نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ہم نے ان عمرانی و سیاسی اصولوں کو اسلام کے اصولوں کے ساتھ ملا کر اختیار نہ کیا تو نقصان اپنا ہی کریں گے۔ ہماری اس روش سے بھی انہیں کچھ نقصان نہ ہوگا۔

عہد حاضر میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ریاست کے اصول وہاں سے لینے ہوں گے البتہ یہ دیکھنا ہوگا کہ جو چیز اسلام کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی چھوڑ دیجئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا معاملہ اس اعتبار سے بالکل مختلف ہے کہ وہ اسلام سے سوفی صد مطابقت رکھتی ہے جبکہ عمرانی و سیاسی فلسفہ و فکر کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ البتہ اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ جو چیز اسلام کے ساتھ سازگاری اختیار کر سکتی ہے وہ گویا کہ ہماری متاع ہے۔ اس معاملے میں ہماری روش یہ ہونی چاہئے کہ "خذ ما صفی' دع ما کدر" اور بقول اقبال۔

خوش تراں باشد مسلمانش کنی
کشتن شمشیر قرآنش کنی

جہاں تک تعلق ہے ریاست اور اس کے دستوری خاکے کا تو دنیا کے کسی بھی جمہوری نظام میں تین چیزیں شامل کردیں تو وہ خلافت بن جائے گی۔ دنیا میں مختلف جمہوری نظام پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک تقسیم تو پارلیمانی جمہوریت اور صدارتی جمہوریت کی ہے۔ اس سے آگے ایک تقسیم وفاقی نظام حکومت اور وحدانی نظام حکومت کی بھی ہے۔ ایک اور نظام جو بہت کم ممالک میں ہے' وہ ہے "Confederal" یا نیم وفاقی طرز حکومت۔ اصولی اعتبار سے ان میں سے جس کو بھی آپ پسند کریں تین چیزیں شامل کرکے خلافت میں تبدیل کرسکتے ہیں۔

ان تین چیزوں کے بیان سے پہلے ایک اور اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ خلافت کا آئیڈیل نمونہ خلافت راشدہ ہے۔ اس خلافت راشدہ کے قریب تر اور عقلی اعتبار سے زیادہ معقول اور مسلم صدارتی نظام ہے پارلیمانی نہیں ہے۔ خلافت راشدہ میں اختیارات کا ارتکاز خلیفہ کی ذات میں تھا۔ عہد حاضر میں امریکہ کا صدارتی نظام اس کے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ خلافت راشدہ میں خلیفہ کا انتخاب تاحیات ہوتا تھا جبکہ یہاں معاملہ چار یا پانچ سال کے لئے ہوتا ہے۔ امریکہ کے صدر کو منتخب ہونے کے بعد کانگرس کی اکثریت کی ضرورت نہیں رہتی۔ امریکہ کے بارے میں جب ہم یہ بات مانتے ہیں کہ وہ دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے' اس حوالے سے بھی بطور دلیل سمجھ لینا چاہئے کہ درحقیقت صدارتی نظام پارلیمانی نظام کی نسبت عمرانی ارتقاء کی بلند تر سطح پر ہے۔

اس بات کو دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ صدارتی نظام پارلیمانی نظام سے بہتر ہے۔ پہلی بات تو

یہ ہے کہ پارلیمانی نظام ان ممالک میں ہے جو برطانیہ کے محکوم رہے ہیں۔ ان ممالک کے باشندوں کی جو بھی تھوڑی بہت تربیت ہے وہ انگریزوں کے زیر سایہ اسی نظام کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام وہ خود اپنائے ہوئے تھے اسی کی تربیت بھی دیتی تھی۔ انگریزوں کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کی بادشاہت کو بھی اپنی روایت پرستی کی بنیاد پر لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملکہ یا بادشاہ بھی رہے' تاج بھی رہے لیکن ان کے ہاتھ میں کچھ نہ ہو' لہٰذا ان کو شوبیت اختیار کرنی پڑی۔ ان کے ہاں دستوری سطح پر ریاست کا سربراہ بادشاہ یا ملکہ ہے جبکہ حکومت کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ تمام اختیارات وزیراعظم اور پارلیمنٹ کے پاس ہیں۔ اس وقت یہ نظام برطانیہ کے علاوہ ان ممالک میں ہے جو برطانیہ کے زیر نگیں رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نظام ان ممالک میں ہے جو اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ بادشاہ کو ایک یادگار کے طور پر ضرور سجا کر رکھنا ہے۔ میں اسے "Humem Zoo" کہا کرتا ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بادشاہ یا ملکہ کی حیثیت یادگار سے زیادہ نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں بھی یہ نظام اس لئے ہے کہ ہم انگریز کے محکوم رہے ہیں۔ بھارت کے ہاں بھی اسی لئے ہے کہ وہ انگریز کا محکوم رہا ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ انتہائی نامعقول نظام ہے۔ میں نے اسے نامعقول اس لئے قرار دیا ہے کہ ایک تو آپ نے بنادیا سربراہ ریاست اور دوسرے کو سربراہ حکومت لیکن ان دونوں کے اختیارات میں توازن کیا ہوگا؟ اس نظام میں کوئی توازن ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک شخص کو آپ سربراہ ریاست بھی بناتے ہیں اور وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا' اس سے زیادہ بھی کوئی نامعقول بات ہو سکتی ہے؟ اس کے برعکس اگر اختیارات سربراہ ریاست کو دے دیجئے تو معاملہ وہ ہوگا کہ دیو کی جان طوطے کی گردن میں ہے۔ صدر صاحب جب چاہیں وزیراعظم صاحب کی گردن مروڑ دیں۔ اگر صدر صاحب کو آپ کوئی اختیارات نہیں دیتے تو پھر صدر تو چوہدری فضل الٰہی بن کر رہ جائے گا جس کو رہا کرانے کے لئے یہ نعرے لکھے جاتے ہیں کہ "چوہدری فضل الٰہی کو رہا کرو۔" آٹھویں ترمیم کی موجودگی میں صدر ضیاء الحق جیسا ہوگا کہ جونیجو صاحب کو ایک منٹ میں رخصت کر دیا۔ اگر صدر کے پاس اختیارات نہیں ہیں تو وہ دکھانے کے لئے ایک یادگار ہے۔ اس کا کام اتنا ہی ہے کہ باہر سے کوئی مہمان آئے تو اس سے مل لے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں تو بہ بیٹھا بیٹھا بھی اکتا جائے گا اور کچھ کرنے کو نہ ہوگا تو سازش کرے گا

اصول طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جدید ریاست کے جو تین گوشے عدلیہ' انتظامیہ اور مقننہ معین کئے جاتے ہیں' صدارتی نظام میں یہ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ صدر ایک دفعہ منتخب ہونے کے بعد اب کانگرس کا دست نگر نہیں رہا۔ امریکی میں ایسے بھی ہوتا رہا ہے کہ کانگرس میں اکثریت ڈیموکریٹس کی رہی ہے جبکہ صدر ریپبلیکن رہا ہے۔ صدر بڑی یکسوئی سے انتظامی امور سرانجام دیتا ہے جبکہ قانون سازی کانگرس کا کام ہے۔ کانگرس کسی خارجی دباؤ کے بغیر اپنا کام کرتی ہے' لہٰذا کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔ عدلیہ پوری آزادی کے ساتھ آئین و قانون کی حفاظت کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ اس کے برعکس پارلیمانی نظام میں مقننہ اور انتظامیہ گڈمڈ ہوتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی مصیبت ہے کہ کسی وقت بھی چند مینڈک پھدک سکتے ہیں یا چند گھوڑے بک سکتے ہیں' لہٰذا وزیراعظم صاحب کا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے۔

پارلیمانی نظام کی خامیاں آج ہمارے سامنے زیادہ کھل کر آگئی ہیں۔ پاکستان کے حالیہ انتخابات کے بعد آزاد امیدواروں کی حکومتیں بنی ہیں۔ گویا آزاد امیدوار اکثریتی پارٹیوں کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ بعض صوبوں میں تو یہ تماشا بھی دیکھا گیا ہے کہ جتنے آزاد امیدوار ہیں سب کے سب وزیر بنادیئے گئے ہیں جبکہ پارٹی والے بیٹھے ہوئے "ٹک ٹک دیم دم نہ کشیدم" کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ صدارتی نظام اتنا صاف ستھرا ہے کہ آپ نے صدر کا انتخاب کر لیا ہے اب صدر جس کو اہل سمجھے وزیر بنائے۔ صدارتی نظام میں وزراء کا کانگرس سے ہونا ضروری نہیں ہے جبکہ پارلیمانی نظام میں وزراء کے لئے دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک ایوان کا رکن ہونا ضروری ہے۔ صدارتی نظام میں ان لوگوں کی صلاحیتوں سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جو سیاست کے کھیل سے دور ہیں لیکن کسی خاص شعبے میں expert ہیں۔ آپ کو مالیات کے لئے ایسا آدمی چاہئے جو جدید معاشیات سے پوری طرح آگاہ ہو' اب ضروری نہیں کہ ایسا آدمی پارلیمنٹ کا ممبر بھی ہو۔ پارلیمانی نظام میں جب تک الیکشن نہیں لڑے گا وزیر نہیں بن سکتا۔

ان اصولی باتوں کے بعد اب ہم ان تین چیزوں پر روشنی ڈالیں گے جن کے شامل کرنے سے کسی بھی نظام حکومت کو خلافت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ پہلی بات یہ تسلیم کرلی جائے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ خلافت کے لئے پہلی شرط لازم ہی یہ ہے کہ حاکمیت سے اللہ کے حق میں دستبردار ہوجایا جائے۔ حاکمیت اللہ کے لئے ہے اور ہمارے لئے خلافت ہے۔ اس بات پر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہم اس ملک میں رہ رہے ہیں جس نے دستوری سطح پر اللہ کی حاکمیت کا اعلان کیا ہے۔ یہ بات اس اعتبار سے بھی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ پوری دنیا میں صرف یہ ایک ہی ملک ہے جس کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ ان لوگوں کے لئے دعا کرنی چاہئے جن کی کوششوں سے قرارداد مقاصد پاس ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ قرارداد مقاصد کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ بہت مشکل حالات میں منظور ہوئی تھی۔ جب جماعت اسلامی دستور اسلامی کا مطالبہ لے کر میدان میں اتری' اس وقت اسمبلی میں مخلص مسلم لیگیوں کے علاوہ خالص ملحد لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے کہا تھا کہ آج جب یہ قرارداد منظور ہو رہی ہے تو ہمارے سر شرم سے جھکے جا رہے ہیں۔ ہم آج مہذب دنیا کے ساتھ آنکھیں چار کرنے کے قابل نہیں رہے۔ بقول اکبر الہ آبادی۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جاجا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

قرارداد مقاصد میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ ہمارے پاس جو بھی اختیارات ہیں وہ ذاتی نہیں بلکہ Delegated ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے دی گئی مقدس امانت ہیں۔

ایں امانت چند روزہ نزد ماست
در حقیقت مالک ہر شے خدا ست

یہ اختیارات الٰہی حدود کے اندر استعمال ہوں گے جو اصل حاکم نے معین کی ہیں۔ گویا دستوری سطح پر خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ دنیا میں یہ واحد ملک ہے جس میں دستوری سطح پر حاکمیت باری تعالیٰ کا اقرار موجود ہے ورنہ دنیا کے دوسرے ممالک میں صرف دستور میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ

Officialy religion of this state is Chirstainty

مسلمان ممالک کے لئے یہ لکھا ہوتا ہے کہ اس ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ یہاں کی اکثریت مسلمانوں یا عیسائیوں پر مشتمل ہے۔

ہمارے ہاں دستور میں یہ بھی موجود ہے حالانکہ قرارداد مقاصد کے بعد ان الفاظ کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ دستوری سطح پر یہ طے کر دیا جائے کہ یہاں کوئی قانون کتاب و سنت کے منافی نہیں بنایا جائے گا۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اصولی طور پر حاکمیت تو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے لیکن اس کا نفاذ کیسے ہوگا؟ آپ کے ہاں جو بھی مقننہ ہے' آپ اسے پارلیمنٹ' مجلس ملی' مجلس شوریٰ یا کسی بھی نام سے موسوم کریں' اس کا دائرہ قانون سازی کیا ہوگا؟ ظاہر ہے یہ ادارہ جدید ریاستی ڈھانچے کا ایک اہم حصہ ہے۔ نظام خلافت میں اس کے اختیارات قانون سازی قرآن و سنت کے تابع ہوں گے۔ چنانچہ دستوری سطح پر یہ طے کر دیا جائے گا کہ ——

"Legislature authority is limited by the injunction of the Quran and the Sunnah"

—— اس کی بہتر تعبیر سورۂ حجرات کی آیت نمبر ا ہے۔ فرمایا گیا " یاایھاالذین امنوا لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ" اے اہل ایمان اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو' اللہ کی حدود قرآن میں آگئی ہیں جبکہ رسول کی حدود حدیث میں موجود ہیں۔ اللہ کا قائمقام قرآن ہے اور رسول کا قائمقام اس کی سنت ہے۔ لہٰذا آئینی سطح پر قرآن و سنت کی کامل بالا دستی بغیر کسی استثنیٰ کے قبول کرنی ہوگی۔ اگر اس میں سے ایک چیز بھی نکال دی تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں سورۂ البقرہ کی آیت ۸ کی زد میں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں " افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزی فی الحیوہ الدنیا ویوم القیمہ یردون الی اشد العذاب" اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اس کی بہترین تعبیر ایک حدیث مبارکہ میں آئی ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں "مثل المومن کمثل الفرس فی اخیبتہ" مومن کی مثال ایک گھوڑے کی سی ہے جو اپنے نٹے سے بندھا ہوا ہے۔ اس بات کو آپ ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص جو کہ نہ کسی اللہ کو مانتا ہے نہ کسی آسمانی ہدایت پر ہی اس کا یقین ہے۔ یہ ایک مادر پدر آزاد گھوڑا ہے' جہاں چاہے جائے۔ اب قرآن کو مان لیا تو قرآن کے احکام سے بندھ گیا ہے اور رسول کو مان لیا تو رسول کے احکام سے بندھ گیا ہے۔ یہ حدیث مبارکہ اسلامی ریاست اور نظام خلافت کے دستور کی بہترین تعبیر ہے۔ اس حقیقت کو ایک اور مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ کے پاس کافی کھلا میدان ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا گھوڑا زرا چلے پھرے۔ آپ اسے سو گز کی رسی سے باندھ لیتے ہیں۔ اس سے سو گز نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آئے گا۔ اس دائرے میں گھوڑا آزاد ہے' جنوب میں جائے یا شمال میں جائے' مشرق میں جائے یا مغرب میں جائے۔ لیکن ایک سو ایک گز میں نہیں جاسکے گا۔ یہ آزادی اور پابندی کی بہترین مثال ہے۔ گویا اس دائرے کے اندر اندر "امر کم" ہے لہٰذا جو چاہو کرو۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے دائرے کو عبور نہیں کرسکتے۔ اللہ اور اس کے رسول کی حدود سے تجاوز اسلام سے تجاوز کے مترادف ہے۔

ایک مغالطے کا ازالہ بھی ضروری ہے جو ہمارے مذہبی مزاج کے حامل لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب اگر اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی تو شریعت ساری موجود ہے لہٰذا کسی مقننہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ دراصل بہت ہی کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ کہ ہمارے ہاں اجتہاد کا دروازہ کئی سو سال سے بند ہے۔ اب اگر آپ اسلامی قانون کا نفاذ چاہتے ہیں تو اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہوگا۔ جدید صنعتی و سائنسی ترقی سے بے شمار نئے مسائل جنم لے چکے ہیں جن کے لئے قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی کی ضرورت ہے۔ صرف زکوٰۃ ہی کے بے شمار مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ کارخانوں پر زکوٰۃ کیسے ہوگی؟ کیا ٹرکوں اور بسوں کو اونٹوں پر قیاس کریں گے؟ کروڑوں روپے کی مشینری ہے' اس پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں ہوگی؟ یہاں میں اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا صرف مسائل کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ اس سے بھی بڑھ کر آج کل جو قانون سازی ہوتی ہے وہ بجٹ ہے۔ آپ ٹیکس لگانا چاہتے ہیں تو کس شرح سے لگائیں گے۔ اب ٹیکس سے جو آمدنی ہوگی اسے کیسے تقسیم کریں گے؟ Allocation کیا ہوگی' تعلیم کو کیا دیں گے' صحت پر کتنا کچھ صرف کریں گے؟ ملکی تعمیر و ترقی کے دوسرے منصوبوں پر کس شرح سے خرچ کریں گے نیز دفاع پر کتنا خرچ کریں گے؟ ان تمام باتوں کا فیصلہ کون کرے گا؟۔ یہ سارا کام مقننہ کا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور بات سمجھ لیجئے کہ ہمارا دین اللہ کا بتایا ہوا ہے۔ وہ تعالیٰ "الحکیم" ہے۔ ہمارے ہاں اگر اصول یہ ہو تا کہ کوئی قانون نہیں بن سکتا جس کی جڑیں کتاب و سنت میں نہ دکھائی جا سکیں تو ہمارے لئے قانون سازی کا دائرہ بہت ہی محدود ہو جاتا ہے۔ اس اصول کے برعکس ہمیں یہ اصول دیا گیا ہے کہ کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا جو کتاب و سنت کے منافی ہو۔ اس دوسری صورت میں دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ ہمارے فقہا کا اصول یہ ہے کہ ہر شے حلال ہے الا یہ کہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ حرام ہے۔ اس کے برعکس اگر اصول یہ ہو کہ ہر شے حرام ہے الا یہ کہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ حلال ہے تو ایسی صورت میں حلال کا دائرہ بہت سکڑ جائے گا جبکہ حرام کا دائرہ بہت پھیل جائے گا۔ جب مباحات کا دائرہ وسیع ہے تو قانون سازی کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔

اسی بات کو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ اب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا۔ اگرچہ ان کی اس بات کو ان کے فرزند نے بہت الجھا کر فساد ذہنی پیدا کیا ہے۔ میں علامہ اقبال کی اس بات کو صد فی صد درست مانتا ہوں۔ پارلیمنٹ کے ذریعے اجتہاد قرآن و سنت کے اندر ہوگا۔۔۔ اجتہاد ہوتا ہی وہ ہے جو قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہو۔ اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی کہ پارلیمنٹ جو شے پاس کر دے وہی دین بن جائے۔ اس لئے کہ پارلیمنٹ کے اختیارات کو اس قدر وسیع کرنے سے تو حاکمیت پارلمنٹ کے پاس چلی جائے گی جبکہ اسلامی ریاست میں حاکمیت فقط اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ عوامی حاکمیت کا تصور کفر اور شرک ہے۔ ہمیں "عوامی حاکمیت" اور "عوامی خلافت" میں فرق کرنا ہوگا۔

پارلیمنٹ کے ذریعے اجتہاد کیسے ہوگا؟ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ یہ عہد حاضر کے بہت ہی اہم مسائل ہیں۔ جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ اسلامی شریعت میں مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے لہٰذا ایک مسئلہ پر میں کہتا ہوں کہ یوں ہونا چاہئے' یہ جائز ہے جبکہ کوئی دوسرا شخص اجتہاد کرتا ہے کہ یہ رائے ہونی چاہئے اور اس کے نزدیک یہی اقرب الی السنہ ہے۔ اب مندرجہ بالا صورت میں کس کا اجتہاد نافذ ہوگا' یہ پارلیمنٹ طے کرے گی۔ ظاہر ہے کہ مباح کے بارے میں پارلیمنٹ طے کرسکتی ہے۔ ہاں حرام کو حلال نہیں بنا سکتی۔ اگر معاملہ مباحات کا ہے تو اکثریت

سے طے کر لیجئے' اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس بات کو ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ ان مسائل کو طے تو پارلیمنٹ ہی کرے گی۔

اس بات کو ایک اور حوالے سے بھی سمجھایا جاسکتا ہے۔ دور بنو عباس میں امام اعظم ابو حنیفہؒ پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کر لیجئے۔ آپ کے اجتہادات پر سارا نظام چلے گا۔ امام ابو حنیفہؒ نے انکار کر دیا۔ واقعتہ یہ بات بھی ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے اور وہ سید الطائفہ اور امام اعظم کہلانے کے مستحق ہیں۔ انکار اس لئے کیا کہ اسلامی قانون ابھی Formative Stages میں ہے۔ میں بھی اجتہاد کر رہا ہوں اور دوسرے مجتہدین بھی موجود ہیں لہٰذا میں یہ حق اپنے لئے اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ میرا اجتہاد نافذ ہو جائے۔ امام ابو حنیفہؒ جانتے تھے کہ قوت نافذہ بادشاہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ میرا انتخاب کر رہا ہے۔ اس کی مثال سمجھ لیجئے کہ آج سے چند سو سال پہلے اورنگزیب عالمگیر نے علماء کی ایک کمیٹی بنادی۔ انہوں نے اپنے دور کے حالات کے مطابق فتاویٰ مرتب کر دیئے حالانکہ پہلے بھی فتاویٰ اور کتابیں موجود تھیں لیکن حالات کی تبدیلی کے تحت اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ بات سمجھ لی جائے کہ علماء کو چنا گیا تھا لہٰذا اس دور ملوکیت میں جو بادشاہ سلامت کو پسند تھے انہی کو لاکر جمع کر دیا گیا۔ یہ کوئی منتخب ادارہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ انہوں نے جو فتاویٰ مرتب کئے تھے اسے اپنے بل پر نافذ نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ قوت نافذہ بادشاہ کے پاس ہے۔ آج قوت نافذہ ایک شخص کے پاس نہیں رہی بلکہ پارلیمنٹ کے پاس چلی گئی ہے۔ لہٰذا آج وہی اجتہاد نافذ ہوگا اور قانون کا درجہ حاصل کرے گا جو پارلیمنٹ منظور کرے گی۔ (جاری ہے...)

بقیہ: کنونشن

آخر میں ایک حدیث رسول پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ یہ حدیث صحیح مسلم شریف میں ہے اور اس کے روای عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ الجاھلیہ" جو مسلمان اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں تھا' وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اس بیعت کے قلادہ کی دو شکلیں ممکن ہیں۔ اگر نظام خلافت قائم ہے تو خلیفہ المسلمین سے بیعت ہوگی۔ اس کے برعکس اگر نظام قائم نہیں تو نظام قائم کرنے کے لئے ایک جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت فی المعروف کرنی لازم ہوگی۔ OO

بقیہ: کشمیر

اور کے مفادات کے آلہ کار بن رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کا اصل ذمہ دار کون ہے؟۔ پوری طرح کوئی نہیں بتا سکتا۔ البتہ اقبال اخوند جیسے حضرات کا جو جنیوا میں پاکستانی وفد کے قائد تھے' امریکی مفادات کے لئے کام کرنا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ امریکہ کی کشمیر میں دلچسپی سے ہر شخص آگاہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اگر بھارت سے کشمیر الگ ہوتا ہے تو اسے آزاد اور خود مختار رکھا جائے۔ اس کے بعد ایران ہے۔ تین سال قبل ایران نے کشمیر میں بھارتی مظالم کی وجہ سے ہندوستانی وزیر خارجہ کے ایران کے دورہ سے معذرت کرلی تھی۔ آج جنیوا میں وہی ایران پاکستان کا ساتھ دینے سے معذوری ظاہر کر رہا ہے۔ کیا اس کے لئے ایران یا چین کو ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے؟۔ کیا ایک سازش کے تحت اس قسم کی فضا تیار نہیں کی جارہی؟۔

بھارت کو کبھی بھی اس بارے میں غلط فہمی نہیں رہی کہ کشمیری عوام کیا چاہتے ہیں اور اب تو انہوں نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر دنیا کے سامنے کھل کر اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ کیا اب بھی استصواب رائے کی ضرورت باقی ہے؟۔ غلام نبی ہکرو نے بتایا کہ "خود مختار" کشمیر کا نعرہ محض ایک چال کے طور پر بلند کیا جارہا ہے جس کا مقصد پاکستان اور کشمیر کے عوام کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹانا ہے۔

(بشکریہ امپیکٹ انٹرنیشنل' لندن' مئی ۱۹۹۴ء)

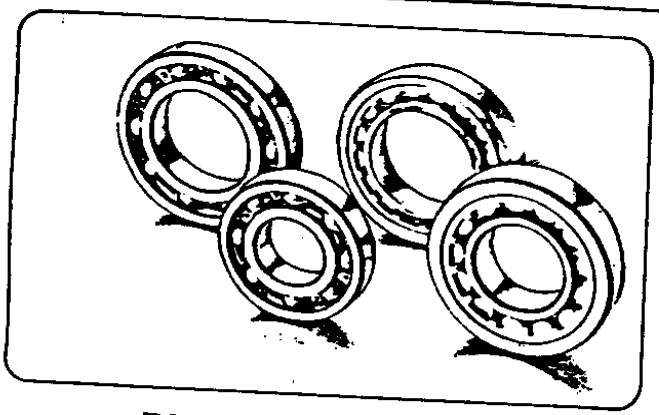

KHALID TRADERS
IMPORTERS—INDENTORS—STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER—SMALL TO SUPER—LARGE
AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

PLEASE CONTACT
TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

نقطۂ نظر

اس کردار کو نباہنا موجودہ حکومت کے بس کی بات نہیں

سید معین الدین ایڈووکیٹ

پاکستان کا بین الاقوامی کردار

قوم کو کوئی قائد میسر نہیں لیکن اجتماعی قیادت ضرور موجود ہے

افغانستان میں دنیا کی سب سے جابر سپرپاور کی یقینی شکست اور متفقہ طور پر طے شدہ پسپائی سوویت یونین کے مصنوعی گھروندے کی مکمل تباہی و بربادی کی فوری وجہ بن گئی اور جبر و استبداد کا مظہر روس حالیہ تاریخ کا ایک سیاہ ورق قرار پایا تو یہ پاکستان کی عالمی سیاست اور تدبر کا ایک عظیم الشان ثبوت اور مظہر ہے۔ پاکستان نے جہاد افغانستان کی کامیابی کی صورت میں عالمی سیاسی چلن اور عالمی نمبرداری کو ایک نیا رخ دیا اور عالمی بساط سیاست کے پس منظر و پیش منظر کو مکمل طور پر تبدیل کرکے رکھ دیا ہے جس کے بعد بین الاقوامی میدان میں ایشیائی اور یورپی کردار بھی نظر آنے لگے ہیں جبکہ اس سے پیشتر سرد جنگ کے دور میں صرف مغرب چھایا ہوا تھا۔ اب بین الاقوامی سطح پر پاکستان بھی ایک اہم حیثیت کا حامل ہے۔ دنیا کے تین خطوں یعنی وسط ایشیا' جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں پاکستان کی شرکت کے بغیر کوئی معاملہ یا مسئلہ تسلی بخش طریق پر طے نہیں پاسکتا۔ سوویت یونین کے غائب اور روس کے بے اثر ہوجانے کے بعد امریکہ کو بین الاقوامی میدان میں کم از کم دو یورپی اقوام یعنی جرمنی اور فرانس کا مقابلہ درپیش ہے۔ فرانس نے امریکہ کی بالادستی کبھی قبول نہیں کی اور ۱۹۵۴ء سے ناٹو سے علیحدہ ہے۔ جرمنی کی قومی انا کو امریکہ نے ہمیشہ مجروح کیا ہے۔

پاکستان ایٹمی ٹیکنیک کی دفاعی صلاحیت کا مکمل طور پر حامل ہے اور کوئی بینظیر اس کو "رول بیک" نہیں کرسکتی۔ بہرکیف امریکہ صرف ایٹم بم کے زور پر عالمی نمبردار نہیں بن سکتا۔ عالمی ساکھ پیدا کرنے اور اپنا اعتبار جمانے کے لئے انسانی فلاح و بہبود اور تجارتی صلاحیت و وسائل کو بروئے کار لانا پڑتا ہے جن میں امریکہ بہت نہیں تو کافی پیچھے جا پڑا ہے۔ آج دنیا کی اقتصادی و تجارتی سپرپاور جاپان اور جرمنی ہیں جن کے لئے اقوام عالم میں خیرسگالی کے جذبات پائے جاتے ہیں اور امریکہ کے لئے نفرت و حقارت پائی جاتی۔ امریکہ کی اسکی برتری اس کے خلاف نفرت بڑھاتی چلی جارہی ہے۔ جاپان نے امریکہ کو تجارتی رعایت دینے سے واضح طور پر انکار کردیا ہے۔ یورپ کے ساتھ امریکہ کی تجارتی چپقلش زراعتی پیداوار کے سلسلے میں بہت نمایاں ہے۔ آج سیاسی تسلط کا دور نہیں' تجارتی روابط کا رشتہ ہے جو حاکم و محکوم کا نہیں بلکہ فریقین کی برابری کا رشتہ ہے۔ امریکہ فکری طور پر مار کھا چکا ہے لیکن ابھی روس کی طرح مصنوعی دم خم کا مظاہرہ کررہا ہے اور ایک دن اچانک اسی کی طرح ڈنک نکلا عفریت بن کر رہ جائے گا۔

اقتصادیات میں سیاسی تسلط کی بجائے پیداواری صلاحیت اور عالمی سطح پر اشیائے صرف کا حسن اور کفایت باعث کشش ہوتی ہے اور امریکہ اس معاملہ میں جاپان' یورپ' کوریا' تائیوان اور سنگاپور کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتا۔ امریکہ مقبولیت کا نہیں' بلکہ ایک اکھڑ سپرپاور کا مزاج رکھتا ہے جو قبولیت پیدا کرنے کی طرف آتا ہی نہیں اور سیاسی دباؤ کا حربہ استعمال کرنا ہی امریکہ کا بہترین ہتھیار ہے۔ بہرکیف پاکستان نے عالمی سطح پر امریکہ کے بہت مضبوط حریف پیدا کردیئے ہیں اور امریکہ انہی حریفوں میں الجھ کر رہ جائے گا۔ امریکہ کے دباؤ پر کوئی ملک اپنی پیداواری صلاحیت کم کرنے کو کبھی تیار نہ ہوگا اور یہی چپقلش امریکہ کو گھن کی طرح کھا جائے گی۔

بزعم خود عالمی سپرپاور کو اپنا ظاہری قدوقامت اور اپنی عالمی ساکھ اور نمبرداری کو قائم رکھنے کے لئے چپقلش کے مختلف میدان اور گوشے بطور چپقلش زون قائم رکھنے پڑیں گے جو نتیجۃً خود سپرپاور کی بے بضاعتی اور بے وقعتی کا باعث ہوں گے اور انجام کار امریکہ اپنے پیدا کردہ بحرانوں کا شکار ہوکر ایک الگ تھلگ اکائی کی صورت اپنی جغرافیائی حدود میں محدود ہوکر رہ جائے گا یعنی دنیا کو اس سپرپاور کی چیرہ دستیوں سے نجات مل جائے گی۔

عالمی سطح پر موجودہ عالمی تناظر میں جہاد کشمیر کی حالیہ انتہائی سرگرم جدوجہد آزادی نے پاکستان کو پھر ایک دفعہ عالمی سٹیج پر اہم ترین کردار سونپ دیا ہے مگر اس کردار کو نبھانا موجودہ وفاقی حکومت کے بس کی بات نہیں۔ بھٹو خاندان کی حکومت ایک وراثتی اور نسلی اقتدار ہے جو ایک "سٹی سٹیٹ" کا خواہاں اور اسی پر مطمئن رہ سکتا ہے۔ ایک عظیم قوم اور پاکستان جیسی عظیم ریاست کی ہمہ جہتی تقاضوں کے مطابق ذمہ داریاں سنبھالنا اور نباہنا بھٹو خاندان کے بس کا روگ نہیں۔ میرا مقصد بھٹو خاندان پر کوئی تنقید و تبصرہ نہیں بلکہ تمہیدی طور پر موجودہ صورت حال کا حقیقی اظہار ہے تاکہ آئندہ کے پیچیدہ سرگرم اور مشکل عالمی صورت حالات کا اعتماد سے مقابلہ اور سامنا کیا جاسکے۔

پاکستان کے گردوپیش ایسے حالات اور تشویشناک واقعات رونما ہورہے ہیں جن کا مواجہہ ایک بہت مضبوط اعصاب کی حامل قیادت ہی کرسکتی ہے خواہ وہ شخصی ہو یا اجتماعی۔ بظاہر شخصی قیادت نظر نہیں آرہی لیکن اجتماعی قیادت ضرور موجود ہے اور وہ اپنے اجتماعی کردار سے قوم کی رہنمائی کرسکتی ہے۔ رہنمائی سے مراد اقتدار یا انتخابات نہیں ہیں بلکہ ایسی فکری و عملی قیادت جو مسلمانان پاکستان کو موجودہ حالات میں ایک تربیت یافتہ قوم کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

پاکستان میں فکری اعتبار سے متوازن سیاسی تربیت کی آبیاری کا اس سے بہتر موقعہ شاید ہی پھر کبھی

ملے۔ آج قوم پوری طرح سے دیدہ و دل وا کئے ایک بہتر قیادت کی راہ دیکھ رہی ہے۔ ہر لمحہ بڑھتا ہوا خلفشار بہتر قیادت کی طلب کو تیز سے تیز تر کرتا چلا جارہا ہے۔ مایوسی صرف دانش ور حضرات میں پائی جاتی ہے' عوام اب بھی ہر قیمت پر ملی تقاضوں کا بھرپور ساتھ دینے کے لئے میدان عمل میں آنا چاہتے ہیں مگر راہ نہیں پارہے۔ میں یہاں پھر عرض کردوں کہ میرا مقصد انتخابات یا اقتدار نہیں' صرف فکری رہنمائی ہے جو پاکستان میں مضبوط' سرگرم اور فعال سیاسی کارکنوں کا ایک ایسا حلقہ اور گروہ پیدا کردے جو ہر قسم کے مہم جو بازیگران سیاست کا خود ہی اپنے طور پر توڑ ثابت ہو' جو ملک و قوم کی بیڑی میں ہربات اور پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے عزم کے ساتھ ملک و ملت کے اساسی نظریات و فکر کے خلاف ہربات اور اقدام کے سامنے سینہ سپر ہو جائے۔

پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے' وہ ہم سب پر عیاں ہے۔ ہر گزرنے والا لمحہ ملک و ملت کو مزید پیچیدگیوں اور خلفشار کا شکار بنا رہا ہے لیکن پورے ملک کی سطح پر مصلحت اندیشی سے پاک کوئی موزوں اور سچی آواز نہیں اٹھ رہی۔ اقتدار کے ارد گرد یا دائرہ اقتدار میں قوم' ملت' اسلام اور ملک کا ذکر بھی ہوتا رہتا ہے لیکن صرف برائے وزن بیت' مقصدیت کا حامل نہیں ہوتا۔ شرافت کی جو خوبی ہے' وہی اس کی کمزوری بھی ہے۔ شرافت کہنی مار کر آگے نہیں بڑھتی' اسے کوئی پکارنے والا ہونا چاہئے' وہ لبیک کہنے کو تیار ہے' قربانی و ایثار اور ہر آزمائش کے لئے ہمہ تن تیار لیکن پکارنے والا پکارے ضرور۔ ہر طلوع ہونے والا دن گرداب بلا میں اضافہ کرتا ہی نظر آرہا ہے۔ رستگاری کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

بھٹو خاندان ایک سوچی سمجھی سازش اور پروگرام کے تحت حکومت اور حکومتی کارکردگی کو مرحلہ وار تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ جعفر و صادق کو حکومتی کردار کا کوئی تصور نہیں ہوتا' ان کا مقصد اقتدار کی سرمستیوں تک محدود ہوتا ہے۔ دوسری طرف بھٹو خاندان کی سرپرست واحد سپرپاور مع یہود و ہنود پاکستان کو امریکہ کی ایک ذیلی ریاست بنانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ پاکستان ان کے عالمی مقاصد و مفادات کی راہ میں (خلیج کے تیل اور جنوب ایشیا کے حوالے سے) ایک ناقابل عبور چٹان کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے خلاف سازشوں میں بہت تیزی آگئی ہے۔ بھٹو خاندان ان مذموم ارادوں کی تکمیل کے لئے اندرون پاکستان راہ ہموار کرنے کی ہمہ جہتی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ بزعم خود واحد سپرپاور مع یہود و ہنود (یہاں میں ایک بات عرض کردوں' امریکہ میں آئندہ دس سالوں کے اندر یہودیوں کا حشر وہی کچھ ہوگا جو پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں ہوا تھا یہاں اس کی تفصیل کو گنجائش نہیں لیکن پس منظر تیار ہو چکا ہے) ایک نہایت خوفناک سازش کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ مصر اور انڈونیشیا کے درمیان بھارت کو ایک منی سپرپاور بنانے پر امریکہ اور یہود و ہنود کا اتفاق ہو چکا ہے۔ یہ مسلم دنیا کے ابھرتے ہوئے تشخص اور اسلامی بلاک کی تشکیل کے خلاف ایک بہت بڑا دباؤ ہے (اسلامی بلاک کی تشکیل زمانے کے بہاؤ کا تقاضا ہے۔ جس کے سامنے کوئی بند نہیں باندھا جاسکتا) بھارت کو کسی قیمت پر جنوب ایشیا میں فیصلہ کن اہمیت حاصل نہیں ہونی چاہئے کیونکہ یہ مسلم دنیا کو محبوس کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔ پاکستان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ رائے عامہ کی اس سمت تربیت و رہنمائی کرے تاکہ اسلامی دنیا اس بین الاقوامی دباؤ کا مقابلہ اور سامنا کرنے کو تیار ہو جائے۔ مسلم دنیا کے متحدہ موقف کے سامنے واحد سپرپاور اور بھارت ٹھہر ہی نہیں سکتے اور ایک دفعہ بحر ہند میں امریکہ کو غرق کر دیا گیا تو اسرائیلی ریاست کا ڈنک بھی نکل جائے گا اور وہ ایک بے وزن ریاست بن کر رہ جائے گی۔

یہ کوئی فوری مقاصد کے حصول کا پروگرام نہیں بلکہ اسلامی دنیا کی بالادستی کا ایک مستقل لائحہ عمل ہے جو مفاد پرستانہ رجحانات کی بیخ کنی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ مقاصد کی آبیاری اور ایثار و قربانی کا جذبہ بھی بیدار کردیگا۔ ملت کو ایک منزل بھی مل جائے گی اور اقتدار کے محور سے باہر نکل کر عالمی سطح پر اپنا وجود منوانے کی تگ و دو گھٹیا ذاتی مفاد کی دلدل سے ملت کو نکالنے کی راہ کو بھی روشن کردے گی۔ سیاسی تربیت کا طویل المدت پروگرام وسائل کی فراہمی کا زیادہ محتاج نہیں ہوتا۔ مستقل پروگرام کا وسیلہ اس کے اپنے اصول' اپنے مقاصد اور منزل کا تعین' خیال و فکر کا اشتراک اور مقصدی ہم آہنگی ہے اور یہی اصل زاد راہ بھی ہے۔ مقصدی لگن جتنی زیادہ ہوگی' ربط باہمی بھی اتنا ہی مضبوط اور خلوص کا آئینہ دار ہوگا۔

اس تمام گفتگو کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ درد مند حضرات کو عملی طور پر میدان عمل میں اتر آنا چاہئے۔ قافلہ چلتا بھی رہے گا اور بڑھتا بھی رہے گا۔ اگر منزل کا تعین ہو چکا ہے تو زاد راہ بھی مہیا ہے۔ اپنی اپنی سواری اور اپنا اپنا توشہ لے کر فکری ہم آہنگی کی بنیاد پر سفر شروع کردیا جائے۔ انشاء اللہ منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی۔ ○○

کشمیر میں استصواب رائے کی ضرورت ہے؟!

اخذ و ترجمہ: سردار اعوان

"اس وقت کشمیر میں بھارت اور پاکستان دونوں سے آزادی حاصل کرنے کا زبردست جذبہ پایا جاتا ہے" واشنگٹن ٹائمز کے کالم نگار کارڈ میئر نے یہ الفاظ کشمیری امریکن کونسل کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر' ڈاکٹر غلام نبی فائی سے منسوب کئے ہیں۔ جبکہ غلام نبی بگرو کا جو بھارتی مقبوضہ کشمیر میں حقوق انسانی کمیشن کے چیئرمین ہیں' واشنگٹن آمد پر کہنا یہ تھا کہ مجاہدین کے اندر کوئی سیکولر عنصر موجود نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جموں کے ہندو اور لداخ کے بدھ' مسلم اکثریت والے خود مختار کشمیر کا حصہ بننے پر کبھی راضی نہیں ہوں گے اور آزاد جموں اور کشمیر بھی اس طرح کے خود مختار کشمیر کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتا۔ ہندو اور بدھ کشمیر کے پاکستان سے ساتھ الحاق کی صورت میں بھی اس سے الگ رہیں گے۔ اس لے بجائے بدھ لداخ کے چین کے زیر تسلط حصے میں رہنے کو ترجیح دیں گے اور کشمیری ہندو بھارت نواز جموں میں۔ چنانچہ وادی کے مسلمان خود مختار کشمیر کی حمائت کیوں کریں گے کہ یعنی' پاکستان' چین اور بھارت کے تین طرفہ دباؤ کا شکار ہوں۔ ہر طرف سے محصور "خود مختار کشمیر" ہرگز کوئی قابل عمل حل نہیں۔

ڈاکٹر فائی غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کشمیری ہندو خود مختار کشمیر کے اندر مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ بہت ہی عجیب بات ہوگی کیونکہ جب پانچ لاکھ فوج اور دوسرے بھارتی حفاظتی دستے وہاں کے ہندوؤں کی حفاظت نہیں کر پا رہے تو

(باقی صفحہ 9 پر)

"نوائے وقت" کا ایک یادگار اداریہ

اسلام ہی قدرِ مشترک تھی اور اب بھی ہے

ون یونٹ کا مطالبہ ہے تو تری آواز مکے اور مدینے

۱۷ مئی کے نوائے وقت سے ایک تراشہ اس کی اپنی سرخی اور انٹرو سمیت نقل کرنے کے علاوہ ایک مختصر جواب بھی نذر قارئین ہے جو معاصر عزیز کو برائے اشاعت ارسال کیا گیا ہے---- ہم اس تبادلہ خیال کو مفید سمجھتے ہیں بشرطیکہ "نوائے وقت" بھی ہمارے نقطہ نظر کو اپنے صفحات میں جگہ دیتا رہے تاکہ اس کے قارئین کے سامنے بھی تصویر کے دونوں رخ آئیں---- مدیر

اقتدار احمد

موقر معاصر "نوائے وقت" نے اپنا ایک اداریہ جو قیام پاکستان کے چند ماہ بعد حضرت قائداعظمؒ کی زندگی میں شائع ہوا تھا' اپنی ۱۷ مئی کی اشاعت میں ڈاکٹر اسرار احمد کی خدمت میں پیش کیا جو ہم سب نیازمندوں کے لئے تبرک کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مجاز نمائندے کی حیثیت میں مجھے ان کے لئے اس ہدیہ کو شکریے کے ساتھ قبول کرنے کا اختیار حاصل ہے' سو رسید حاضر ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔ تاہم اسے حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ صرف چار روز قبل اپنے خطاب جمعہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے خود بھی وہی بات کہی تھی جو اس اداریئے کی مراد ہے۔ اسی صبح نوائے وقت کے اداراتی صفحہ پر شائع ہونے والے عبداللطیف سیمی صاحب کی تنقید "ڈاکٹر اسرار احمد کی سورج کے نئے اسرار و رموز" کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ سیٹھی صاحب نے مجھے تو اگرچہ جلی کٹی ہی سنائی ہیں لیکن میں بہرحال ان کی اس بات کی مشروط تحسین کروں گا کہ "اب بھی اس ملک کی بہتری اور بھلائی اسی میں ہے کہ وہ "ون یونٹ" پھر بنایا جائے اور اس قسم کی ایڈمنسٹریشن قائم کرے جو ون یونٹ کے مقاصد کو پورا کر سکے"۔ مشروط بھی اس معنی میں کہ ون یونٹ کا دارالحکومت ملک کے جغرافیائی مرکز میں بنایا جانا چاہئے تھا' مثلاً ملتان۔

ماضی میں لاہور کا انتخاب ہوا تھا تو اس لئے کہ یہاں کے بااثر میاں صاحبان کی جائیدادوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں' وہ سونے کے بھاؤ بکیں۔ اور یہاں کے ٹھیکیداروں کی بھی چاندی ہو جائے کہ نئی تعمیرات کے لئے لوگوں کا دوسرے صوبوں سے آنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ ایسے ہی کچھ دیگر ذاتی و گروہی مفادات بھی تھے جن کا نتیجہ قوم کے حق میں یہ نکلا کہ ایک طرف تو سرحد سے محض چند میل کے فاصلے پر کروڑوں اربوں کی سرمایہ کاری ہو گئی جبکہ سرحد پار اتنے ہی فاصلے پر واقع شہر امرتسر پر بھارتی حکومت نے ایک ٹکا بھی خرچ نہ کیا اور مشرقی پنجاب کا دارالحکومت جاکر چندی گڑھ میں بنایا اور دوسری طرف لاہور پر "پنجابیوں" کی گرفت کے علاوہ سندھ و بلوچستان سے اس شہر کی طولانی مسافت کی پیدا کردہ دشواریوں نے لوگوں کے دلوں میں بھی دوری پیدا کر کے چھوڑی۔ خیر جانے دیجئے یہ تو پرانے قصے ہیں' آیئے نئے سرے سے صوبائیت کے مسئلے کے اس حل پر غور کریں جو "نوائے وقت" نے اس یادگار اداریے میں بڑے خلوص سے تجویز کیا تھا۔

موجودہ صوبوں کی نئی حدبندی اور ان کی تعداد کو دگنا چگنا بڑھانے میں ہمیں ملک و قوم کا جو فائدہ اور بعض ان مسائل کا حل نظر آتا ہے جو ہماری اپنی غلطیوں کی پاداش میں لاینحل ہوتے جا رہے ہیں' وہ اگر خام خیالی ہے اور زیادہ مصلحت ان چار صوبوں کو بھی اب ایک اکیلے "مغربی پاکستان" میں ضم کر دینے میں ہے تو ہماری طرف سے اس پر بھی صاد ہے۔ پاکستان کا دوسرا "صوبہ" تو اب بنگلہ دیش بن چکا ہے لہٰذا اس اقدام کے نتیجے میں یہاں کا نظام حکومت وحدانی ہو جائے گا اور یہ بات آپ کو صرف کان میں بتانے کی ہے کہ یہی نظام خلافت سے بھی زیادہ مناسبت رکھتا ہے تاہم آبادی کے بے تحاشا بڑھ جانے کے باعث چھوٹے انتظامی یونٹ تو شاید ڈویژن کی سطح پر پھر بھی بنانے ہی ہوں گے اور انہیں کچھ زیادہ اختیارات دینے کی ضرورت ہو گی تاکہ لوگوں کو اپنے مسائل کے حل کے لئے دور دراز کے سفر نہ کرنے پڑیں۔ پھر اس سطح پر عوامی نمائندگی کا بھی کوئی کم سے کم ایسا انتظام لازم ہو گا جو آج کل لنگڑی لولی ڈسٹرکٹ کونسلوں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ مجوزہ پروگرام میں شامل ہو تو صوبوں کی اس تقسیم پر اصرار کی کوئی وجہ نہ رہے گی جس پر آپ بہت برا مناتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ ڈویژن کی سطح پر اضافی اختیارات کی فراہمی کے علاوہ عوامی نمائندگی کا اہتمام بھی کیا جائے تو نئے صوبے بنانے میں آخر کون سی ہینگ پھٹکری لگتی ہے؟۔ اس وزنی اعتراض کے جواب میں کوئی دلیل نہیں' صرف معذرت ہی پیش کی جا سکتی ہے کہ بدقسمتی سے وہ عمل بعد میں دن دونی رات چوگنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا یا مفاد پرستوں کی طرف سے بڑھایا جاتا رہا جو قیام پاکستان کے فوراً بعد خود قائداعظم کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا جبکہ وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے ساتھ دوسرے کئی محاذوں پر چومکھی لڑائی میں بے طرح مصروف تھے۔ نوائے وقت کے محولہ بالا اداریئے میں ہی مذکور ہے کہ "اہل پاکستان کا رجحان ملیت کی طرف نہیں صوبائیت کی طرف ہو رہا ہے" اور "بعض اوقات کابینہ وزراء میں مختلف وزیر اپنے محکمہ کے کام پر کم توجہ دیتے ہیں البتہ دوسرے وزیروں کا تختہ الٹنے کی فکر انہیں ہر وقت دامن گیر رہتی ہے"۔ کیا کوئی بھی معقول پاکستانی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ بعد میں قوم کے اس رجحان اور ارباب اقتدار کی اس فکر میں کمی لانے کا تو کوئی حیلہ نہ کیا جا سکا' ان میں مسلسل اضافے کے عوامل اپنی کارگزاری کے مظاہرے میں بالکل آزاد رہے۔ ہمیں یہ تو پسند نہیں کہ کسی خاص فرد یا گروہ پر اس کا الزام عائد کریں لیکن کیا واقعہ یہ نہیں کہ ---

---

پوری قوم بحیثیت مجموعی اس جرم میں شریک ہے جس کے باعث ملت میں انتشار و افتراق کا کریلا نیم چڑھا ہو گیا۔

تنزل و انحطاط کے اس ردے پر تو ردے چڑھتے گئے لیکن اس بنیاد کو مضبوط کرنے کی کوئی کوشش نہ ہوئی جو ایک ایسے قومی جذبے اور احساس پر قائم تھی جسے نوائے وقت کے یادگار اداریے میں "اسلام اور صرف اسلام" سے وابستہ قرار دیا گیا۔ جس فصل کے بیج ملک عزیز کی زمین پر بالکل ابتدا میں ہی بکھیر دیئے گئے تھے اور پھر جسے سینچنے میں پوری قوم چار پانچ عشرے شب و روز لگی رہی وہ فصل اب کٹنے کے لئے تیار ہے۔ کاش

اس مرحلے میں ہی ہم تعصبات اور مفادات سے اپنے آپ کو آزاد کر کے حقیقت پسندانہ روش اپنانے پر آمادہ ہو جائیں اور ذہنی تحفظات میں گھن رہنے کے بجائے زمینی حقائق کا مواجہہ کرتے ہوئے اپنے سنگین مسائل کے "ایڈہاک" نہیں بلکہ مستقل حل تلاش کریں۔ ملک کی آبادی کے مختلف طبقات میں اجنبیت کی جو دیواریں ہماری اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے کھڑی ہو گئی ہیں انہیں دیوار برلن کی طرح گرا دینے کا کوئی طریقہ ہمارے پاس موجود نہیں۔ اب تو ربط باہم پیدا کرنے کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ ایک حد تک بے ربطی کو برداشت کر لیا جائے جس کے بغیر آبادی کے ان طبقات کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ داخلی سکون و اطمینان فراہم کرنے کے بعد انہیں مضبوطی سے آپس میں باندھنے کے لئے اللہ کی رسی ہی درکار ہو گی جو اسلام اور صرف اسلام ہے لیکن کیا اس کی طرف بھی کوئی پیش رفت نظر آتی ہے؟۔OO

پاکستان میں صوبے ختم کر دیئے جائیں

نوائے وقت کا ایک اداریہ.....ڈاکٹر اسرار احمد کی خدمت میں

ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے حالیہ خطبات میں صوبوں کی از سر نو تقسیم بالخصوص پنجاب اور سندھ میں دو نئے صوبوں کے قیام پر زور دیا ہے اور اسے ملک میں بڑھتی ہوئی لسانی و نسلی کشیدگی کا علاج قرار دیا ہے۔ مفسر قرآن ڈاکٹر اسرار احمد وحدت امہ کے علمبردار ہیں اس لئے ملک کو چار سے بھی زیادہ صوبوں میں تقسیم کرنے کے خیالات پر ان کے مداح تعجب کا اظہار کر رہے ہیں ہم ان کی خدمت میں "نوائے وقت" کا ایک اداریہ پیش کر رہے ہیں جو قیام پاکستان کے چند ماہ بعد حضرت قائداعظم کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ (ادارہ)

پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس پر تھی کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور اسی مطالبہ کو سب سے زیادہ تقویت مسلمانوں کے اسی احساس اور جذبے سے پہنچی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ اور جداگانہ ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس جذبے اور احساس کی بنیاد صرف اور صرف اسلام پر تھی۔ ورنہ ایک مدراسی مسلمان اور پنجابی مسلمان میں اسلام کے سوا کون سی چیز مابہ الاشتراک ہے؟ سی پی کا مسلمان سرحد کے مسلمان کی نسبت سی پی کے ہندو کے نزدیک تر تھا۔ اسی طرح اس علاقہ کے مسلمان جسے اب مشرقی بنگال کہا جاتا ہے دوسرے بنگالیوں سے زیادہ مختلف نہ تھے اور اگر اسلام کی قدر مشترک نہ ہوتی تو وہ اپنے آپ کو سندھی مسلمانوں کا ہم قوم سمجھنے کی بجائے عام بنگالی ہندوؤں کا ہم قوم سمجھتے۔ مگر اسلامی قومیت یا ملیت کا احساس اس قدر قوی تھا کہ یو پی' سی پی مدراس اور بمبئی کے مسلمانوں نے جغرافیائی قیود اور حد بندیوں کی پروانہ کرتے ہوئے اور یہ جانتے کے باوجود کہ ..... پاکستان کے معرض وجود میں آجانے سے انہیں براہ راست کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اپنے آپ کو ہندوستانی قومیت سے وابستہ کرنے کی بجائے اسلامی قومیت یا ملیت سے رشتہ جوڑا اور نیم براعظم ہند کے مسلمانوں نے بیک آواز یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم ایک مستقل قوم ہیں اور یہ قوم اپنے لئے ایک آزاد خود مختار وطن کا مطالبہ کرتی ہے۔

جس طرح جغرافیائی' وطنی اور صوبائی امتیاز و تفریق کے مقابلہ پر اس مشترکہ احساس ملی نے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو تقویت بخش کر غیروں کی نظر میں ایک شاعرانہ خواب کو حقیقت کا جامہ پہنایا اسی طرح پاکستان کی نوزائیدہ اور کمزور ناتواں مملکت کو مضبوط اور خوشحال بنانے میں بھی یہی شعور ملی اور احساس "وحدت" دیگانگت باقی سب مادی سیاسی و اخلاقی امور سے زیادہ اہم پارٹ ادا کر سکتا ہے۔ مسئلہ پاکستان کے دفاع کا ہو یا اس کے استحکام کا قوم کے سامنے پاکستان کی خوشحالی کا سوال ہو یا اس کی ترقی کی کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ پاکستانی باشندے احساس ملی سے سرشار ہوں۔ وہ اپنے آپ کو اہل ملت سمجھیں اور ہر فرد اپنے مفاد کو ملت کے مفاد کے تابع بنانے کے لئے رضامند ہی نہیں مضطرب ہو۔ بدقسمتی سے پاکستان میں گزشتہ چند ماہ سے جو حالات پیدا ہو رہے ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہیں اہل پاکستان کا رجحان ملیت کی طرف نہیں صوبائیت کی طرف ہو رہا ہے۔ عوام اور خواص مسائل پر غور و فکر کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ وہ ایک قوم ہیں بلکہ صرف اپنے اپنے صوبہ اور اپنے علاقہ کا مفاد ان کے پیش نظر ہوتا ہے پٹھانستان کا فتنہ' آزاد خلافت کی تحریک' مشرقی بنگال میں بنگالی اور اردو کا جھگڑا سندھ میں پنجابیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اور پنجاب میں مہاجر و انصار کی اسلامی اور قابل تقلید نہیں بلکہ مضر و مصنوعی تفریق یہ سب فتنے دراصل ایک ہی بیمار ذہنیت کے مختلف مظہر ہیں۔ بیماری ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور اگر رہنمایان قوم اور عوام فوراً اس کا علاج شروع کر دیں تو مریض کو شفایاب ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ مگر علاج ایسا ہے جو معالج اور مریض دونوں سے جرات اور ہمت کا طلب گار ہے۔

ہماری رائے میں صوبائی عصبیت پاکستان کے حق میں زہر قاتل ہے۔ اس زہر کا تریاق یہ ہے کہ کم از کم مغربی پاکستان میں صوبائی امتیازات اڑا دیئے جائیں یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب پاکستان کے نئے آئین میں مغربی پاکستان کے صوبوں پنجاب سرحد سندھ اور بلوچستان کا وجود ختم کر دیا جائے۔ انتظامی حیثیت سے اس میں کوئی دقت نہیں نہ انتظام ملکی میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے بلکہ بجا طور پر اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے تقسیم سے پہلے پنجاب کے ۲۹ اضلاع تھے۔ صوبے اڑا دیئے جائیں تو مغربی پاکستان میں سارے پرانے صوبوں کے اضلاع کو ملا کر بھی کل تعداد انتیس تیس سے زیادہ نہ ہو گی اور یہ تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ ہندوستان کے صوبے یو پی میں اضلاع کی تعداد ۵۶ یا ۵۸ ہے۔ اس انتظام سے پاکستانی عوام کم از کم ان مصائب کا شکار نہیں ہوں گے جو انہیں کسی اور سبب سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے بھگتنے پڑتے

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

رچرڈ نکسن کی کتاب "سیزدی مومنٹ" کے باب "دی مسلم ورلڈ" کا ترجمہ (قسط پنجم)

اسرائیل کا وجود اور سلامتی امریکہ کی اخلاقی ذمہ داری ہے!

ترجمہ: فہیم صدیقی

امن مذاکرات کو بہر صورت کامیاب ہونا چاہئے

عرب علاقے اسرائیل اپنی سلامتی کو دائو پر لگائے بغیر واپس نہیں کر سکتا

اسرائیل کی بقا اور سلامتی کی ہماری ذمہ داری کوئی سرسری سی بات نہیں۔ ہم کوئی عام اتحادی نہیں بلکہ ایک ایسے رشتہ میں بندھے ہوئے جس کی اخلاقی اہمیت کاغذی معاہدوں سے کہیں زیادہ ہے اگرچہ یہ بات روایتی فہم و فراست کے خلاف جاتی ہے کیونکہ اسرائیل امریکہ کے لئے کوئی جغرافیائی اہمیت نہیں رکھتا۔ اسرائیل کے ساتھ مشترکہ جنگی مشقیں اور عسکری صف بندی کے علاوہ جاسوسی نظام میں اشتراک امریکہ کے لئے سود مند ہے لیکن ناگزیر نہیں۔ اسرائیلی افواج جنگ کے میدان میں اپنا لوہا تو منوا ہی چکی ہیں، خلیجی جنگ میں شامل نہ ہو کر انہوں نے ایک اہم ترین علاقائی پیچیدگی میں اپنے کردار کی تحدید بھی قبول کر کے دکھادی۔ اسرائیل کو ہماری ضمانت کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ ایک تو یہ دوسری جنگ عظیم کا ورثہ ہے، دوسرے ہمارے اخلاقی اور نظریاتی مفادات کا تقاضا بھی ہے کہ جارحیت کے عزائم میں گھری ہوئی جمہوریتوں کا وجود خطرے میں نہ پڑے۔ امریکہ کا کوئی صدر یا کانگریس کبھی بھی اسرائیلی ریاست کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

اسرائیل کے بہت سے حامیوں کا استدلال ہے کہ امریکہ کو اسرائیل کی موجودہ لیکوڈ حکومت کی سخت گیر پالیسی کی واضح حمایت کرنی چاہئے۔ ان کا اصرار ہے کہ اسرائیل اپنی سلامتی کو خطرہ میں ڈالے بغیر دریائے اردن کا مغربی کنارہ، غزہ کی پٹی اور جولان کی چوٹیاں عربوں کو واپس نہیں کر سکتا۔ بعض تو یہاں تک دعوے کرتے ہیں کہ مغربی کنارہ دراصل جودیا اور سامریہ کا بائبل میں مذکورہ وہ علاقہ ہے جو تاریخی طور پر اسرائیل کا حصہ ہے۔ یہ سب لوگ پی ایل او سے مقبوضہ علاقوں کے بارے میں کسی طرح کے مذاکرات کے لئے اسرائیل کے قطعی انکار کی پوری حمایت کرتے ہیں اور ایسی کسی مصالحت انہیں ہرگز قبول نہیں جس سے بالخصوص مشرقی یروشلم اور جولان کو ضم کرنے کا اقدام متاثر ہوتا ہے۔

اسرائیل کی سلامتی اور بقا کی حمایت کی حد تک تو ہماری پالیسی بالکل صحیح ہے لیکن اس کی موجودہ حکومت کے سخت اور بے لچک مطالبات کی پشت پناہی ہمارے لئے مناسب نہ ہوگی۔ جارح اور جارحیت کے شکار ممالک کے درمیان اخلاقی توازن کی بحث سے قطع نظر ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ علاقے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے نتیجے میں اسرائیل کے قبضہ میں آئے ہیں۔ عرب ریاستوں کی جارحانہ عسکری پالیسیوں کے باعث یہ بحران پیدا ہوا تھا جس سے جنگ ناگزیر ہو گئی تاہم حملہ کرنے میں پہل اسرائیل نے کی تھی۔ اسرائیل کے سابق وزیر اعظم مناہم بیگن نے اگست ۱۹۸۲ء میں کہا۔ "جون ۱۹۶۷ء میں صحرائے سینا میں مصری فوجوں کا اجتماع یہ ثابت نہیں کرتا تھا کہ جمال عبدالناصر واقعی اسرائیل پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں ایمانداری سے یہ واقعہ تسلیم کرنا چاہئے کہ جنگ شروع کرنے یا اسے ٹال دینے میں انتخاب کا اختیار ہمارے ہاتھ میں تھا اور ناصر پر حملہ کرنے کا فیصلہ خود ہم نے کیا"۔ چونکہ جنگ دونوں اطراف کے اقدامات کا نتیجہ تھی لہٰذا اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے دو قرار دادیں ۲۴۲ اور ۳۳۸ پاس کیں۔ یہ یکطرفہ مراعات کے لئے نہیں بلکہ مقبوضہ علاقوں کی دو طرفہ واپسی کے عوض قیام امن کی وکالت کرتی تھیں۔

تین وجوہات میں جن کی بناء پر ہمیں "امن کے لئے علاقے کی واپسی" کے فارمولے کے تحت امن کوششوں کو آگے بڑھانا چاہئے:

۱۔ عرب اسرائیل تنازعہ ہمارے بیرونی امداد کے بجٹ کو بالکل غیر متوازن کر دیتا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں اسرائیل اور مصر کے چھ کروڑ باشندوں کو امریکہ کی طرف سے بیرونی امداد کے لئے مخصوص پندرہ ارب ڈالر کی رقم میں سے چالیس فی صد سے زیادہ حصہ ملا جبکہ باقی رقم کے لئے غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے چار ارب سے بھی زیادہ انسان ہماری توجہ کے امیدوار تھے۔ ۱۹۷۰ء کے وسط سے اب تک امریکہ اسرائیل کو ۴۹ ارب ڈالر کی براہ راست اور بالواسطہ امداد دے چکا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۶٫۴ ارب ڈالر ۱۹۷۴ء اور ۱۹۸۹ء بطور قرض دیئے گئے جنہیں بعد میں معاف کر کے عطیات میں شمار کر لیا گیا۔ مشرق وسطیٰ میں توازن برقرار رکھنے کے لئے امریکہ نے مصر کو ۲۸ ارب ڈالر کی امداد ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۱ کے درمیان دی اور ۶٫۸ ارب ڈالر کے قرضے معاف کئے گئے جن کی واپسی کی ویسے بھی کوئی امید نہیں تھی، اسرائیلی اور مصری دفاعی بجٹ کی ضمانت اس پر مستزاد۔ امدادی بجٹ کے اتنے بڑے حصہ کے عرب اسرائیل تنازع کی نذر ہو جانے کے بعد ہم نہ مشرقی یورپ کی نوزائیدہ جمہوریتوں کے استحکام میں مدد دے سکے، نہ لاطینی امریکہ کی معاشی جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹا سکے اور نہ ہی افریقہ اور جنوبی ایشیا کے بدنصیب عوام کی کوئی مدد کر سکے۔

۲۔ عرب اسرائیل تنازع نے مسلم دنیا سے ہمارے تعلقات کو زہر آلود کر دیا اور ہم ان کی ترقی پسند حکومتوں اور ان معتدل مزاج رہنماؤں کو بھی پورا تعاون بہم نہ پہنچا سکے جو مغرب کے حامی ہیں۔ اسرائیل کا عرب علاقوں پر قبضے کا تسلسل اور فلسطینوں کے ساتھ اس کا بڑھتا ہوا ناروا سلوک مسلم دنیا میں

انتہا پسندی کے جذبات کو ابھار رہا ہے اور مصر کے حسنی مبارک جیسے اعتدال پسند رہنماؤں پر سے بھی مسلم دنیا کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ تمام مسلم رہنما فلسطینی عوام کے جائز عزائم سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اسرائیلی قابض فوجوں کے خلاف "انتفادہ" کی مسلح جدوجہد کو دہشت گردی نہیں بلکہ جائز مزاحمت سمجھتے ہیں۔ بہت سے رہنما کویت کے معاملے میں صدام حسین کی شرمناک حمایت کے باعث پی ایل او کی قیادت پر تنقید تو کرتے ہیں لیکن انہوں نے نہ فلسطینی جدوجہد کی حمایت سے منہ موڑا اور نہ وہ اس حمایت سے کبھی دست بردار ہو سکیں گے۔ کیمپ ڈیوڈ میں انور سادات نے معاہدہ امن پر ہرگز دستخط نہ کئے ہوتے اگر اسرائیل مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کو داخلی خود مختاری دینے کے عبوری انتظامات کا وعدہ نہ کرتا جن کی مدت پانچ سال سے زائد نہیں ہوگی۔ اسی دوران علاقے کی مستقل حیثیت کے تعین کے لئے تین سال کے اندر مذاکرات کی ابتداء ہونی تھی۔ اس نظام الاوقات کے تحت اس پورے عمل کو ۱۹۸۴ء میں مکمل ہو جانا چاہئے تھا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ سچ یہ ہے کہ اسرائیل نے مصر اور امریکہ دونوں کے ہاتھ باندھ کر چھوڑ دیئے ہیں۔

۳۔ عرب اسرائیل تنازعہ بارود کا ایک ڈھیر ہے جس پر کوئی دھماکہ ایک ایسی جنگ کا باعث ہو سکتا ہو جس میں مجبوراً امریکہ کو بھی مداخلت کرنی پڑے اور نوبت ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال تک پہنچ جائے۔ اگرچہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی آئندہ اگر کوئی تصادم ہوتا ہے تو وہاں بھی ایٹمی خطرہ موجود ہے لیکن اس میں امریکہ کے ملوث ہو جانے کا امکان بہت کم ہے۔ اس کے برعکس اگر مشرق وسطیٰ میں جنگ چھڑتی ہے تو امریکی مداخلت یقینی ہوگی۔ جب ۱۹۷۳ میں مشرق وسطیٰ میں جنگ چھڑی تو بطور صدر امریکی مقننہ کے رہنماؤں سے اپنی ایک ملاقات مجھے خوب یاد ہے۔ جنگ کے آغاز میں لڑائی کی صورتحال اسرائیل کے خلاف جا رہی تھی۔ اسی دوران سوویٹ یونین نے مصر اور شام کو فوجی ساز و سامان ہوائی جہازوں کے ذریعہ پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ اس حوالے سے جب کانگریس کے ایک نمائندے نے سوال کیا کہ کیا امریکہ ماسکو کے اس اقدام کے جواب میں کوئی قدم نہیں اٹھائے گا تو میں نے برجستہ جواب دیا کہ "امریکہ کا کوئی صدر اسرائیل کو ختم کرنے کی اجازت کبھی نہ دے گا"۔ میں نے فوراً اسرائیل کو شکست سے بچانے کے لئے طیاروں کے ذریعے بہت بڑے پیمانے پر اسلحہ بھیجنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی امریکہ کی ایٹمی جنگی مشین کو بھی تیار رہنے کا حکم دے دیا تاکہ علاقے میں روسی مداخلت کے خطرے کا سدباب ہو سکے۔ اگر جنگ ہوتی ہے تو ہمارا براہ راست یا بالواسطہ اس میں ملوث ہونا ناگزیر ہے۔ لہٰذا بالخصوص اس صورت میں کہ اسرائیل ایٹم بم بنا چکا ہے اور اس کے مخالفین کے پاس کیمیاوی اور حیاتیاتی ہتھیار موجود ہیں' امریکہ امن کوششوں کی ناکامی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

امریکہ اور اسرائیل دونوں کا مفاد اسی میں ہے کہ مقبوضہ زمین کی واپسی کے بدلے میں امن کے اصول کے تحت کوئی تصفیہ ہو جائے کیونکہ اگر اسرئیل مقبوضہ علاقوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے اصرار کرتا ہے تو اس کی اخلاقی حیثیت کو ضعف پہنچے گا۔ اسرائیل کے بانی رہنماؤں میں سے ایک ڈیوڈ بن گوریان نے جسے امریکی خارجہ سیکرٹری فوسٹر ڈلس نے ایک بار کتاب مقدس زبور میں مذکور پیغمبروں سے تشبیہ دی تھی' اسرائیلی انتہا پسندوں کو انتباہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو لوگ مقبوضہ عرب علاقوں کو اسرائیل میں ضم کرنے کی بات کرتے ہیں وہ یہ نظرانداز کر جاتے ہیں کہ اس سے اسرائیل کے اصل مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ہمارے انتہا پسند اپنے منصوبے کی تکمیل میں کامیاب ہو گئے تو اسرائیل میں نہ تو یہودیت رہے گی اور نہ جمہوریت۔ عرب آبادی میں ہم سے بڑھ جائیں گے اور ان پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے ہمیں غیر جمہوری اور جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑیں گے۔ اگرچہ اسرائیل کی اپنی چالیس لاکھ آباد میں دس لاکھ روسی یہودی آبادکاروں کے اضافے کے بعد کل آبادی پچاس لاکھ ہو جائے گی اور اسرائیل اور مقبوضہ علاقوں میں آباد بیس لاکھ عربوں سے یہ تعداد یقیناً زیادہ ہے لیکن انہیں غلام بنا کر رکھنا اسرائیل کے داخلی امن و سکون کے لئے خطرناک ہوگا۔ اگر اسرائیل مقبوضہ علاقوں کو ضم کر لیتا ہے تو اس کی سلامتی کے مسائل اسی طرح پیچیدہ ہو جائیں گے جیسے عراق اور روس جیسی کثیرالقومی ریاستوں میں ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اسرائیل لازمی طور پر ایک دو قومی عسکری ریاست بن جائے گی جس سے نہ صرف یہودیت کی روح متاثر ہو گی بلکہ امریکہ کی ہمدردی بھی اخلاقی جواز کھو دے گی جو خالصتاً اس ریاست کو اپنی بقا کے لئے حاصل ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ اسرائیل کے موجودہ رہنما امن کوششوں کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں جبکہ آج حالات اس کے حق میں موزوں ترین حل کے لئے جتنے سازگار ہیں اتنے سازگار اسرائیل کی ۴۴ سالہ زندگی میں کبھی بھی نہیں تھے۔ موجودہ صورت حال کا جائزہ یہ ہے کہ:

☆ **عراق** ۔ جنگ میں اس کی کمر ٹوٹ چکی ہے' عرب دنیا میں بھی وہ تنہا ہو کر رہ گیا ہے اور قرضوں اور جنگی معاوضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اب وہ اسرائیل کے خلاف کسی بھی روایتی عسکری مہم کے قابل نہیں رہا۔

☆ **پی ایل او** ۔ یہ تسلیم صدام حسین کی حمایت کے باعث عرب دنیا میں اپنی وقعت کھو چکی اور سعودی عرب جیسے اپنے سابق ساہوکاروں کی ہمدردیوں سے محروم بھی ہو چکی ہے۔ دیگر ممالک میں اس کے حامیوں میں بھی اس کے لئے پہلی سی گرمجوشی باقی نہیں رہی۔

☆ **شام** ۔ معاشی طور پر بدحال اور اقتصادی طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے۔ خلیجی جنگ کے بعد اس کی یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی کہ اپنے روسی ہتھیاروں سے وہ اسرائیل کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

☆ **اردن** ۔ سیاسی انتہا پسندی اور گرتی ہوئی معیشت کے دو پاٹوں کے درمیان پھنسا ہوا یہ ملک اسرائیل کے لئے کیا خطرہ بنے گا۔ جو خود اسرائیل سے مفاہمت چاہتا ہے تاکہ خلیجی جنگ میں مغربی ممالک سے پیدا ہونے والی کشیدگی ختم کر سکے اور دوبارہ مغرب سے تعلقات استوار کر لے۔

☆ **مصر** ۔ اسرائیل سے امن کا معاہدہ کرنے والا واحد عرب ملک جو ایک معتدل تجدد پسند قوت ہے' اب عرب دنیا کی قیادت پر پھر سے فائز ہو گیا ہے۔

☆ ۔ روسی یہودیوں کی اسرائیل میں آمد تقریباً ۳۰،۰۰۰ ماہانہ ہے۔ عرب رہنما اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ عرب علاقوں کے انضمام کو روکنے کا آخری موقع ہے ورنہ روسی یہودیوں کی آبادکاری کے لئے عرب علاقوں ہی میں نئی آبادیاں بنتی چلی جائیں گی۔

☆ ۔ ماسکو اپنے اندرونی مسائل میں اس بری طرح گھرا ہوا ہے کہ امن کوششوں میں روڑے اٹکانے کی اپنی سابقہ روش کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا

تحقیق کے تقاضے اور ایک استاد کی استادی

جماعت اور جمعیت میں سوچ پر پہرے کیسے بٹھائے جاتے ہیں!

اقتدار احمد

ابھی پچھلے دنوں ایک نوجوان طالب علم سے ملاقات ہوئی جو اسلامی جمعیت طلبہ کا ایک ذمہ دار اور فعال رکن ہے۔ جمعیت کے مطبوعہ لٹریچر میں ایک کتابچہ اس کی نظر سے گزرا جس میں سابق ناظمین اعلیٰ سے لئے ہوئے انٹرویو دیے گئے ہیں تو ایک پرانے سابق ناظم اعلیٰ ڈاکٹر اسرار احمد کی گفتگو نے اسے متاثر کیا چنانچہ وہ تلاش میں رہا کہ ان کے حالیہ خیالات سے بھی آگاہی کا موقع میسر آئے۔ جو کندہ یا بندہ' وہ تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان کے امیر و داعی کی چند مطبوعہ چیزیں پڑھنے اور ایک آدھ تقریر کا کیسٹ سننے میں کامیاب ہو گیا جنہوں نے اس کے دل کی دنیا بدل کر رکھ دی ہے۔ اس میں محرومی کا شدید احساس پیدا ہوا کہ جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ نہ صرف اپنے انقلابی فکر سے عملاً منحرف ہو چکی ہیں بلکہ وہاں اپنے متعلقین کی ان خطوط پر ذہنی تربیت سے بھی مجرمانہ تغافل برتا جا رہا ہے۔ اس نوجوان کی باتوں سے محسوس ہوا کہ ان حلقوں میں ڈاکٹر اسرار احمد کے فکر کی رسائی پر بغیر اعلان کے لیکن شعوری کوشش کے ذریعے اور حیلے بہانوں سے قدغن لگا دی گئی ہے۔

اس واقعے کے چند ہی روز بعد ہمیں پشاور سے اپنے ایک ساتھی کا مراسلہ موصول ہوا کہ "تنظیم اساتذہ" کے جریدے ماہنامہ "افکار معلم" لاہور نے اپنے شمارہ فروری ۹۴ء میں "تحقیق کے تقاضے" کے عنوان سے ایک تحریر شائع کی ہے جس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر بھی الزام عائد کیا گیا ہے کہ تحقیق کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ ایک نمونہ ان کی تحریر میں تضادات کا اور ایک طنز و استہزا کے استعمال کا اس مقالے میں شامل تھا جس کی وضاحت اس مراسلے میں ہم سے طلب کی گئی ہے۔ دونوں حوالوں اور ان پر تبصرے کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ جماعت و جمعیت میں ڈاکٹر اسرار احمد کی طرف سے دلوں کو پھیرنے کا کام کس چابک دستی سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ تو ایک علمی جریدے کا اختیار کردہ انداز ہے' خیال فرمائیے کہ سینہ گزٹ کے ذریعے کیا کچھ نہ کیا جاتا ہو گا۔ یاد رہے کہ "تنظیم اساتذہ" اور جماعت اسلامی کے درمیان صرف ایک پردہ ہی حائل ہے اور پردہ بھی کیا' چلمن کہئے ورنہ اول الذکر جماعت کی جمعیت طلبہ سے بھی بڑھ کر ذیلی تنظیم ہے بلکہ ہمارے علم کی حد تک تو عملی شکل یہ ہے کہ جماعت کے جس رکن کو معلمی کی کوئی مستقل پوسٹ مل جائے' اس سے توقع کی جاتی ہے کہ جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو کر وہ تنظیم اساتذہ کا رکن بن جائے گا۔

"تحقیق کے تقاضے" میں صفحہ ۳۶ پر "تحریر میں تضادات" کی ذیلی سرخی کے تحت مصنف' جناب پروفیسر عبدالرزاق خاں صاحب فرماتے ہیں :

"بعض محققین اپنے مقالات میں متضاد چیزیں پیش کر دیتے ہیں جو خود ان کی تحقیق کی نفی کرتے ہیں۔ کچھ مصنفین ایک بات بڑے دعویٰ کے ساتھ کرتے ہیں مگر چند صفحے بعد خود اس دعویٰ کے خلاف بات کہہ بیٹھتے ہیں۔ ایسے تضادات پر مشتمل تحریر کا مصنف ایک جانب محقق نہیں کہلا سکتا جبکہ دوسری طرف ایسا مصنف قارئین کی نظر میں وقعت کھو بیٹھتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ محقق بالکل صاف ذہن کا مالک ہو۔ اس کا قلم تضادات سے پاک ہو۔ اور اس کا ذہن انتشار کا شکار نہ ہو۔ ایک مثال اس صورت حال کو بخوبی واضح کر دے گی۔ ذیل کی عبارت "اسلام اور پاکستان" نامی کتاب مصنف ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے لی گئی' جس میں ایک دعویٰ کی نفی چند صفحات بعد نہیں چند سطور بعد کر دی گئی ہے۔ اور مصنف کو اس تضاد بیانی کا احساس تک نہیں ہوا۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ ۳۸ پر سطر نمبر ۸ پر تحریر ہے:

"مودودی اور جماعت اسلامی کا کوئی باقاعدہ ربط وضبط علماء کے ساتھ نہیں ہے۔ اور اب غالباً وہ اپنے سیاسی حوصلوں کی تکمیل کے لئے علماء سے اتحاد کو کوئی اہمیت بھی نہیں دیتے۔"

اس فقرے کے بعد ۸ سطور چھوڑ کر انہوں نے لکھا ہے کہ

"(علماء کرام) سیاسی میدان میں ان کے مذہبی رول کو بنظر الحسان دیکھتے ہیں۔ بلکہ ان کے ایک طبقے نے تو گویا اس معاملے میں جماعت اسلامی کی بے ضابطہ قیادت کو عملاً قبول کر لیا ہے۔" ہر قاری بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ "ربط وضبط کی نفی" اور آگے "بے ضابطہ قیادت قبول کرنا" میں کس قدر تضاد پایا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے حوالے میں ایک تو کتابت کی غلطی ہے جسے ٹھیک کر لیا جائے کہ "بنظر الحسان" کے بجائے کتاب میں "بنظر استحسان" ہے اور پھر یہ دیکھئے کہ محترم پروفیسر صاحب نے حوالے کی عبارت کے آغاز میں ہی اپنے قاری کے ذہن کو ایک جھٹکا دے کر گویا ماؤف کر دیا ہے۔ مولانا مودودی مرحوم سے مبالغے کی حد تک عقیدت رکھنے والے جب یہ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان کے ممدوح کے ذکر میں تو تزاق کرنے پر اتر آئے ہیں یعنی مودودی کے ساتھ "مولانا" کا سابقہ بھی نہیں لگاتے تو ظاہر ہے کہ اس "تضاد" پر غور کرنے کا دماغ وہ کہاں سے لائیں گے جس کی نشاندہی پروفیسر صاحب نے فرمائی ہے اور اصل کتاب دیکھنے کی زحمت کرتا ہی کون ہے؟۔ اسے آپ علمی خیانت نہیں تو کیا کہیں گے کہ ناقل نے حوالہ دیتے ہوئے مولانا مودودی کے نام سے مولانا کا لفظ کتاب کے متعلقہ مقام سے اٹھایا ہی نہیں!۔ پھر اب دیکھئے اور سر دھنئے کہ وہ تضاد کیا ہے؟۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے پہلے حوالے میں بتایا گیا ہے کہ جماعت اسلامی اب علماء کے ساتھ ربط وضبط نہیں رکھتی اور دوسرے میں ذکر ہے کہ خود علماء جماعت کے پیچھے لگنے پر تیار ہیں۔ تو اس میں تضاد کا کون سا پہلو ہے۔ میں اگر کہوں کہ میں تو آپ کی خوشی کے لئے آسمان سے تارے توڑ کر لانے کو تیار ہوں' آپ مجھے گھاس بھی نہیں ڈالتے تو ایک چار جماعت پاس شخص بھی بتا دے گا کہ اس بیان میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ یہ تو دو مختلف شخصیات کا اپنا اپنا جداگانہ طرز عمل ہے ---- معلوم ہوا کہ محولہ بالا حوالوں میں تضاد تلاش کرنے کے لئے آدمی کا پروفیسر ہونا ضروری ہے جو اپنا مقالہ بھی کسی

ایسے مجلے میں شائع کرا سکے جس کی ادارت بڑے بڑے عالم و فاضل لوگوں کے سپرد ہے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

رہی بات طنز و استہزا کے استعمال کی جس کا الزام اسی کتاب کے صفحہ ۲۹ سے ایک حوالہ نقل کر کے لگایا گیا تو حق یہ ہے کہ طنز و استہزا اس میں موجود تو ہے لیکن شائستگی کی حد کے اندر اندر۔ اس کی صفائی خود مصنف یعنی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ہی کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے دیباچے میں پیش کر دی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور انہی کے الفاظ میں ہم یہاں درج بھی کریں گے تاہم جو بات انہوں نے نہیں لکھی' اس کا اضافہ ہم کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ایک محترم لیکن ہم عصر شخصیت کی بات کر رہے تھے (اصل تحریر جب لکھی گئی اس وقت مولانا مودودی بقید حیات تھے) جس سے ان کا ذاتی تعلق خاصے ہی نشیب و فراز سے گزرا' انہوں نے مولانا سے قربت کا لطف بھی بہت لیا اور پھر فاصلے بھی بہت بڑھے جس میں تلخیاں بڑھ ہی جایا کرتی ہیں۔ ایسی کسی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہوئے قلم کو ذرا بھی لغزش کی اجازت نہ دینا بہت مشکل کام بلکہ "من عزم الامور" ہے جو اس اعتبار سے درگزر کے قابل بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک تجزیہ لکھ رہے تھے' تاریخ نہیں۔ اپنے الفاظ سے ذاتی جذبات و احساسات کا رشتہ ایک مورخ ہی منقطع کر سکتا ہے جو واقعات و حوادث پر اچھی بھلی مدت گزر جانے کے بعد قلم اٹھاتا ہے۔

"اسلام اور پاکستان" نامی کتاب کے طبع سوم میں دیباچے کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

"پیش نظر مجموعے کی اشاعت سے قبل جب میں نے اپنی آج سے پندرہ سولہ سال قبل کی ان تحریروں کا جائزہ تنقیدی نگاہ سے لیا تو الحمدللہ کہ اس امر کا تو پورا اطمینان ہوا کہ ان میں حالات و واقعات کا جو تجزیہ سامنے آیا ہے وہ صد فی صد درست ہے۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ ان میں بعض مقامات پر طرز تعبیر اور انداز تحریر میں تلخی شامل ہو گئی ہے' جو نہ ہوتی تو بہتر تھا ---- گویا اگر میں ان موضوعات پر آج قلم اٹھاؤں تو تجزیہ تو بنیادی طور پر وہی ہو گا لیکن انداز اتنا تلخ نہ ہو گا۔

لیکن اب ان تحریروں سے اس تلخی کو نکالنا نہ ممکن ہے نہ مناسب ---- ممکن اس لئے نہیں کہ وہ ان کے پورے تانے بانے میں بنی ہوئی ہے' اور مناسب یا درست اس لئے نہیں کہ پرانی تحریروں کو اگر پرانی تحریروں ہی کی حیثیت سے شائع کیا جائے تو ان میں رد و بدل تصنیف و تالیف کے اصولوں کے خلاف ہے ---- اگر صاحب تحریر کی رائے میں بعد میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی تو اسے اضافی حواشی کی صورت میں درج ہونا چاہئے یا علیحدہ وضاحت کی شکل میں!

اس ضمن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا' جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن پھر جب اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی اتنا ہی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں طویل عرصے تک مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی' لیکن آخر کار اس پر افسوس' ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آگیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بتمام و کمال عود کر آئے۔

میری پیش نظر تحریریں چونکہ ان تین ادوار میں سے درمیانی دور سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے جس کے لئے میں مولانا مرحوم کے تمام محبین و معتقدین سے بھی معذرت خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ۷۹ء میں امریکہ میں مولانا سے میری وہ ملاقات ہو جاتی جس کی ایک شدید خواہش لئے ہوئے میں وہاں گیا تھا تو میں ان سے بھی معافی حاصل کر لیتا ---- اس لئے کہ اسی زمانے کے لگ بھگ مجھے ایک اللہ گائیسی ملی تھی جس سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ مولانا کے دل میں میری جانب سے کوئی تکدر یا رنج نہیں ہے۔ یہ اطلاع جناب عبدالرحیم' ڈپٹی چیف کیمیکل انجینئر' کراچی پورٹ ٹرسٹ نے دی تھی کہ ایک نجی محفل میں جس میں وہ خود موجود تھے مولانا مرحوم نے میرے بارے میں یہ الفاظ فرمائے تھے کہ: "اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا" جس کی تائید مزید مجھے بفلو میں مولانا کی نماز جنازہ میں شرکت کے موقع پر مل گئی جب مولانا کے خلف الرشید ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے معلوم ہوا کہ میری مولانا سے ملاقات کی خواہش یکطرفہ نہ تھی بلکہ' ان کے الفاظ میں:- "----ادھر ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن---"

بہرحال یہ میرا اور مولانا مرحوم کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میدان حشر میں جب میں ان سے اپنی تلخ نوائی کی معافی چاہوں گا تو وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔

اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ماضی کے طرز عمل کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیں اور اس میں نہ کسی کی محبت و عقیدت کو آڑے آنے دیں نہ کسی کے بغض و عداوت کو راہ پانے دیں' بلکہ یہ بے لاگ تجزیہ صرف مستقبل کے لئے سبق حاصل کرنے کے لئے ہو--- اور اس اعتبار سے انشاء اللہ العزیز قارئین کرام ان تحریروں کو مفید پائیں گے۔"

بقیہ: تاریخی اداریہ

ہیں کہ صوبائی اسمبلیوں میں ہمیشہ اقتدار کی جنگ برپا رہتی ہے بلکہ بعض اوقات کابینہ وزراء میں مختلف وزیر اپنے محکمہ کے کام پر کم توجہ دیتے ہیں البتہ دوسرے وزیروں کا تختہ الٹنے کی فکر انہیں ہر وقت دامن گیر رہتی ہے۔ وقتی طور پر تو یہ تجویز اکثر لوگوں کو بری معلوم ہو گی اور بعض صوبوں میں اہل غرض یہ نعرہ بلند کریں گے کہ پنجابی ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہیں مگر اس تجویز میں ہر صوبہ کے عوام کا بلا امتیاز صوبہ بھلا ہے اور اگر کسی کا نقصان ہے تو محض ایک مختصر سے گروہ کا جس سے اقتدار چھن جائے گا۔ یہ گروہ خود پنجاب میں اس تجویز کے خلاف آواز بلند کرے گا۔ لیکن اس مضر احساس کو کہ فلاں صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور فلاں صوبہ والے ہمیں کھا جائیں گے ختم کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ صوبے ہی ختم کر دیئے جائیں۔ پاکستان میں صرف دو حصے رہ جائیں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔ اور ہم سندھی' پنجابی' بلوچ' سرحدی کی بجائے صرف پاکستانی ہو جائیں۔ وقتی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے لئے صوبہ مغربی پاکستان کی حکومت میں موجودہ سب صوبوں کو نمائندگی دی جائے مگر رفتہ رفتہ کسی تخصیص کے بغیر ہی سب مطمئن ہو جائیں گے کیونکہ اس وقت تک وہ بھول چکے ہوں گے کہ وہ پنجابی یا سندھی ہیں۔

اس تجویز پر عمل کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے مگر ہمیں یقین ہے کہ قائداعظم اس کام کی افادیت کے قائل ہو جائیں تو وہ اسے کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پاکستان کے اخبارات کو خاص طور پر توجہ دینی چاہئے اور رائے عامہ کو اس تجویز کا ہم نوا بنا کر قائداعظم کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں۔ ○○

(سلسلے کے لئے دیکھئے گزشتہ سے پیوستہ شمارہ)

○

اگلے دو تین ہفتے میں ہر تیسرے چوتھے روز مولانا رفیع عثمانی سے جاکر پوچھتا رہا۔ ان کا جواب ایک ہی رہا کہ ابھی کوئی استاد ہاتھ نہیں لگ رہا' تلاش جاری ہے اور جب یہ معاملہ طول کھینچنے لگا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ دوسرے استاد اور نئی کلاس کے انتظار میں بچے کا وقت کیوں ضائع ہو' اسے حفظ کی موجودہ جماعت میں ہی بھیجنا شروع کردیجئے۔ اور نہیں تو باقاعدگی سے مدرسے آنے کی عادت ہی پڑے گی۔ ویسے دوسری جماعت کا انتظام بھی ان شاء اللہ جلد ہوجائے گا۔ ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں نے جی کڑا کرکے عزیزی اسعد کو ناکر دارالعلوم میں قاری صاحب کے سپرد کردیا۔ تین چار ہفتے اور گزر گئے لیکن نئے استاد کو نہ ملنا تھا' نہ ملے۔ اللہ ہی جانے وجہ کیا تھی۔ دارالعلوم کی انتظامیہ کے ہاتھ حسب منشاء کوئی قاری صاحب نہ لگے یا کہیں شرائط ملازمت میں کوئی گڑبڑ ہوجاتی تھی' نتیجہ بہرحال یہ نکلا کہ میرا بچہ اسی کلاس کا ہو رہا۔

ایک دن مجھے ذرا فراغت تھی۔ اپنی فیکٹری کا چکر لگاتے ہوئے جس میں میری رہائش بھی تھی' دیکھا کہ اسعد میاں مدرسے کے وقت میں باہر بچوں کے ساتھ کھیل میں مشغول ہیں۔ پوچھا کہ پڑھنے نہیں گئے تو جواب ملا کہ آج قاری صاحب نے چھٹی کرادی ہے۔ اس نے جس انداز سے یہ بات کہی' وہی غماز تھا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے چنانچہ دفتر سے میں نے اپنے ایک کارندے کو بھیج کر پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ صاحبزادے جھوٹ بول رہے ہیں۔ پھر جب گھر سے بھی یہ توثیق حاصل ہوگئی کہ ایسی چھٹیاں انہوں نے پہلے بھی کئی منائی ہیں تو میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا اور یہ یقین خوش فہمی نہیں' مشاہدے پر مبنی تھا کہ میرے بچوں میں جھوٹ بولنے کی بری عادت موجود نہیں۔ اپنی کمزوریوں کا تو پورا شعور تھا اور اب تک ہے لیکن بچوں کی اٹھان پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا تھا کہ ان کے کردار کی بنیاد میں خام یا "دو نمبر" مواد استعمال نہیں ہوا۔ صدمے کی کیفیت میں دل نے دماغ کو آواز دے کر کہا کہ بندۂ خدا' تمہارے سب سے بڑے بچے کا حافظ قرآن بننا تمہارے لئے سعادت کا باعث تو ہوگا لیکن کیا ایک جھوٹا حافظ بھی تمہیں قبول ہے؟۔ اور اسی صدا کی بازگشت سے یہ فیصلہ برآمد ہوا کہ نہیں' ہرگز نہیں!۔

چنانچہ بلا تاخیر تحفیظ کی کلاس سے اپنے بیٹے کو اٹھالینے کے بعد میں نے چندے اور انتظار کیا اور جب یہ دیکھ کر مایوس ہوگیا کہ دارالعلوم کی انتظامیہ کی ترجیحات میں میرا مسئلہ شاید کہیں تہ میں بھی جگہ نہیں پاسکا تو اسعد میاں کو پھر سے سکول بھیجنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔ آس پاس نظر دوڑائی تو کوئی کام کا ہائی سکول دکھائی نہ دیا۔ پھر سات آٹھ میل کے فاصلے پر ملیر میں جامعہ ملیہ کا ثانوی سکول جاکر دیکھا' وہاں کا ماحول کچھ دل کو لگا اور منے میاں یہاں چھٹی جماعت میں داخل ہوگئے۔ اگلے سال وہ ساتویں میں تھے کہ لندن سے واپسی پر میں ایک دھن کو دماغ پر سوار لے کر آیا جسے مرحوم اقبال سہیل نے عمل کے راستے پر بھی لگادیا تھا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ تم بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت میں سے وافر حصہ عطا کیا ہے' پھر تمہارے گھروں کا ماحول بہت اچھا اور بہت سی ان پیچیدگیوں سے بچا ہوا ہے جن سے محفوظ گھرانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود اگر تمہارے بچوں کی اٹھان شاندار نہ ہو تو یہ تم لوگوں کی سخت نالائقی ہے' جہالت ہے--- یاد رہے کہ مرحوم کی اس قبیل کی گالیوں سے کوئی بڑے سے بڑا بھی بچ نہ سکتا تھا اور میں تو

زندگانی کی گزرگاہوں میں

● —— اقتدار احمد

تھا ہی ان کے برخورداروں میں۔ ان کی زبان سے کھری کھری سننے کے بعد اپنے طرز عمل پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ میں نے زندگی کے اس پہلو پر کبھی غور ہی نہ کیا تھا ورنہ اپنے طرز عمل پر سوچنے کی نوبت آئی تو محسوس ہوا کہ جو مشورے اقبال سہیل دے رہے ہیں' ان تک پہنچنے کے لئے کسی ایسی سائنس میں مہارت درکار نہ تھی جو مجھ جیسے آرٹس گریجویٹ کو میسر نہیں۔ سب کی سب عام فہم باتیں تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو وہ اہمیت دی ہی نہیں جس کی ضرورت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ پرند و چرند کا بھی اپنے بچوں کی پرورش کا اپنا اپنا جبلی انداز ہے جو ازل سے ایک ہی ڈگر پر چلتا آیا ہے اور ابد تک شاید اسی پر چلے' اس لئے کہ ان کی بودوباش کو زمانے کی ترقی نے متاثر نہیں کیا جبکہ ہماری زندگیوں کے نہج میں بڑی بنیادی تبدیلیاں واقع ہوچکی ہیں۔ بچوں کی اٹھان پر اثر انداز ہونے والے دو اہم ترین عوامل جنہیں ہم نظرانداز کئے رکھتے ہیں' یہ ہیں کہ اولاً ذرائع ابلاغ کے بے تحاشا ارتقاء نے بچوں کی ذہانت اور شعور کی سطح کو پہلے کے مقابلے میں بہت بلند کردیا ہے چنانچہ ان کو بہلانا اب آسان ہرگز نہیں رہا اور ثانیاً حالات کے تقاضوں نے خاندان کے ادارے کو شکست و ریخت کا شکار کردیا ہے جس کے باعث اکثر بچوں کو بزرگوں یعنی دادا دادی اور نانا نانی کی شفقت اور نگرانی سے محروم ہونا پڑا ہے۔ اور اسی دوسرے عامل کی ایک ذیلی علت یہ بھی ہے کہ محلے کا وہ نقشہ بھی بگڑ گیا جو نصف صدی پہلے تک ہمارے معاشرے میں جما ہوا تھا اور جس میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ بچے اہل محلہ کی مشترکہ ذمہ داری سمجھے جاتے' بڑے بوڑھے سب کو یکساں پیار دیتے اور ایک سی کڑی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ بچوں کے لئے محلے داروں میں سے کوئی بھی شخص غیر نہ ہوتا۔ کوئی چچا ہے تو کوئی ماموں' کوئی تایا ہے تو کوئی خالو۔ اسی طرح خواتین کچھ خالائیں تھیں کچھ چچیاں تائیاں۔ سکول میں داخلے سے پہلے حرفوں کی پہچان کے لئے بچوں کو مسجد بھیجا جاتا تھا اور یہ تعلق بعد میں بھی منقطع نہ ہوتا کہ سہ پہر میں سیپارہ ہاتھ میں لے کر انہیں اسی کا رخ کرنا پڑتا۔ مولوی صاحب کا بھی بچوں کی زندگیوں میں ایک خاص مقام تھا۔ غرض معصوم بچے بچیوں کے گرد خود کتنی حصار کی ایک فصیل موجود تھی جیسے چھوٹے پودوں کو حفاظتی جنگلے کی شکل میں مہیا کی جاتی ہے۔ یہ فصیل ٹوٹ گئی ہے یا اتنی پست ہوکر رہ گئی ہے کہ بچوں کی ذہانت و فطانت اسے بڑی آسانی سے پھلانگ جاتی ہے۔

والدین کی بڑی تعداد اپنی جگہ نئے سے نئے نفسیاتی مسائل سے دوچار ہے۔ محدود آمدنی رکھنے والے طبقے سے ان کا تعلق ہے تو بلندی کی طرف اٹھتے معیار زندگی اور روز افزوں منگائی نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور اگر معاش کاروبار سے وابستہ ہے تو کاروباری مصروفیات کسی اور طرف دھیان دینے کی مہلت نہیں دیتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ممتا کی ماری ماں تو اگرچہ بچوں کی پرورش میں اپنے ایثار ذات کو ان سب دشواریوں کے باوجود بہت زیادہ کم نہیں ہونے دیتی لیکن باپ دنیا کے بکھیڑوں کے لئے اپنے آپ کو وقف دیکھ کر بچوں کی ذمہ داری سے فارغ ہوجاتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ ستم کہ ماں کی طرف سے تو کبھی کبھی لیکن باپ کی پریشانیوں اور الجھنوں کا زلہ اکثر اوقات عضو ضعیف یعنی پھول جیسے بچوں پر گرتا ہے جنہیں بات بے بات دھنک کر رکھ دیا جاتا ہے۔ ہمارے مربی اور معلم اخلاق' رسول ﷺ نے اگر اصلاح کی غرض سے بچوں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت دی ہے تو امر کا

یہ مفہوم لینے میں آخر کیا دشواری ہے کہ مار پیٹ کی نوبت تب آنی چاہئے جب سکھانے سمجھانے کے دوسرے سب طریقے ناکام ہو جائیں۔

غرض اب ہوش آیا تو سب سے پہلی تبدیلی میرے طرز عمل میں یہ آئی کہ بچوں کی مار پیٹ کا سلسلہ بالکل موقوف ہو گیا اور اسی عمل کا رد عمل یہ سامنے آیا کہ ایک تو وہ پہلے سے بڑھ کر پیارے لگنے لگے' دوسرے واضح طور پر محسوس ہوا کہ وہ بھی میرا اشارہ تک سمجھنے لگے ہیں یعنی تشدد کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اس کے علاوہ باقاعدہ کوشش کر کے میں نے کچھ وقت اپنی مصروفیات میں سے بچوں کے لئے بھی نکالنا شروع کر دیا جس کا ایک مصرف یہ بھی رکھا کہ ان کی تعلیم کے لئے بہتر اداروں کی تلاش کی جائے۔ ایک طویل اور تھکا دینے والی تحقیق و تفتیش کے بعد جس میں کئی مہینے لگے' بڑے بیٹے کے لئے میں نے اپنی رہائش کے مقام سے ٹھیک ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع ایبٹ آباد پبلک سکول کا انتخاب کیا جہاں اس وقت تک تعلیم و تربیت کا معیار بہت بلند تھا اور ایک منفرد خصوصیت وہاں میں نے یہ دیکھی کہ ذریعہ و طرز تعلیم گو انگریزی ہے تاہم طالب علم کو انگریز یا صاحب بہادر نہیں بلکہ ایک عام سا لیکن ذمہ دار پاکستانی مسلمان بنایا جاتا ہے۔

اس وقت تک اسعد میاں جامعہ ملیہ سکول میں ساتویں کا امتحان پاس کر کے آٹھویں جماعت میں آ گئے تھے لیکن ایبٹ آباد پبلک سکول چونکہ شروع ہی ساتویں جماعت سے ہوتا ہے لہٰذا میں نے وہاں کی انتظامیہ کا یہ مشورہ قبول کر لیا کہ منے میاں کو (جنہوں نے ابھی قد نہیں نکالا تھا اور کچھ زیادہ ہی ننھے منے لگتے تھے) آٹھویں کی بجائے ساتویں جماعت میں ہی ڈالا جائے۔

یوں یکے بعد دیگرے میرے دو بچوں' اسعد میاں اور احمد مرحوم' نے ایبٹ آباد پبلک سکول میں چار چار سال لگا کر اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کیا۔ اسعد میاں حفظ قرآن کی سعادت سے تو میری حماقت کے باعث محروم رہ گئے تھے لیکن الحمدللہ کہ حسن قرات ان کی شخصیت کا مستقل جزو بن گیا۔ سکول میں چاروں تعلیمی سال وہ سخت مقابلے کے بعد "سال کے بہترین قاری" قرار دیئے جاتے رہے اور آج تک اپنی "مسجد خانہ" میں عشاء کی جہری نماز ہم انہی کی امامت میں پڑھتے اور قرآن مجید کے ملکوتی غنا سے محظوظ ہوتے ہیں۔۔۔ ایبٹ آباد پبلک سکول میں میرے ان دونوں بچوں کو دوسرے قابل اساتذہ کے علاوہ مسٹر کیچ پول کی شکل میں انگریزی کا بہترین استاد اور جناب بشارت احمد جیسا مہربان و فرض شناس "ہاؤس ماسٹر" میسر آیا جن کا احسان ہمیشہ میری گردن پر رہے گا اور ظاہر ہے کہ اقبال سہیل مرحوم کی نیکی تو میں فراموش کر ہی نہیں سکتا۔ اللہ ہی جانے اب ایبٹ آباد پبلک سکول کس حال میں ہے' میرے بچوں کو تو بہرحال اس ادارے نے قابلیت اور خود اعتمادی سے نوازا اور ان کی وہ صلاحیت صیقل کی ہے جو پھر عملی زندگی میں تدبر' علم اور وسعت قلب و نظر کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یہ دونوں مجھ سے بہت بہتر انسان ثابت ہوئے اور ظاہر ہے کہ انہیں بہتر مسلمان بھی بننا چاہئے۔ چھوٹا ساڑھے سات برس پہلے عین عالم شباب میں قرآن اکیڈمی کے دو سالہ دینی تعلیم کے آخری حصہ کی تکمیل کرتے ہوئے ہمارے علم کی حد تک ایک مسلمان کی موت کو گلے لگا کر خالق حقیقی کی رحمت میں چلا گیا اور ان شاء اللہ وباذن اللہ حشر کے مشکل مرحلے میں میری شفاعت کرے گا۔ بڑے اسعد نے اپنے تیسرے چھوٹے بھائی امجد کی معاونت کے ساتھ کاروبار کا سارا بوجھ بڑی خوبی سے اٹھا کر عرصہ ہوا مجھے بالکل فارغ کر دیا کہ آخری عمر میں ہی مسلمان ہو جاؤں اور اللہ توفیق دے تو آخرت کے لئے بھی کچھ تھوڑی بہت کمائی کر لوں۔ میرے یہ دونوں بیٹے اپنے تایا' امیر تنظیم اسلامی برادرم ڈاکٹر اسرار احمد کی بیعت میں اور ان کی جماعت میں شامل ہیں' احمد بھی گیا تو بیعت کا قلادہ اس کی گردن میں موجود تھا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

اس دفعہ بات ذرا لمبی ہو گئی اور قارئین کو شاید زیادہ دلچسپ نہ محسوس ہوئی ہو' زندگی رہی تو ان شاء اللہ اگلی صحبت میں جگ بیتی' آپ بیتی سے زیادہ ہوگی۔ حضرت مفتی محمد شفیعؒ کے ذکر خیر اور اسی ضمن میں کچھ اور ناقابل فراموش واقعات و حوادث کے بیان میں عمومی استفادے کا خاصا ہی سامان ہوگا۔ ○○

بقیہ: رچرڈ نکسن

امریکہ کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے۔

اسرائیل کی آہنی گرفت وقت کے ساتھ ساتھ کمزور پڑتی جائے گی اور پی ایل او اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کرلے گی۔ شام خلیجی ریاستوں سے ہمدردیاں بٹورے گا اور اس کے لئے امداد کے نئے راستے کھلیں گے۔ سابقہ روسی ریاستوں کے نئے رہنما مشرق وسطیٰ میں اپنے قدم جمانے کی بات پھر سوچنا شروع کر سکتے ہیں فلسطینیوں کی تحریک مزاحمت کو دبانے کی کوشش میں ۸۰۰ سے زائد افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس سے اسرائیل کی سیاسی ساکھ متاثر ہوئی ہے اور جیسے جیسے یہ تعداد بڑھتی جائے گی' ساکھ گرنے کی رفتار بڑھتی رہے گی۔

اسرائیلی عوام کی چالیس فی صد تعداد پی ایل او سے مذاکرات کی حامی ہے۔ یہ لوگ مقبوضہ علاقوں میں واقع کسی چھوٹی سی فلسطینی ریاست کو برداشت کر لیں گے کیونکہ وہ موجودہ غیر یقینی صورت حال سے تنگ آ چکے ہیں۔ اسرائیل کو آج مذاکرات میں سودے بازی کر لینی چاہئے جب وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں طاقتور ہے۔ کہیں وہ وقت نہ آ جائے جب اس کے دشمن اپنی طاقت بحال اور مجتمع کر کے اس میں اپنی مرضی ٹھونسنے کے قابل ہو جائیں۔ کامیاب جہانبانی کا زریں اصول یہ ہے کہ سودے بازی کے لئے سازگار ترین موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دو اور اسرائیل کے لئے وہ موقع آ چکا ہے۔

امریکی مداخلت تو امن کوششوں کی کامیابی کے لئے ضروری ہے لیکن یہ خیال کہ اس مسئلہ کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا جائے' لایعنی ہے۔ اسرائیل کو اپنی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ کی جانبدار جیوری کے ہاتھ میں ہرگز نہیں دینا چاہئے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کی امن فوج نے کئی دوسرے متنازعہ علاقوں میں تصادم کو روکے رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے لیکن عرب اسرائیل تنازعہ میں چار مرتبہ اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ یہاں کا معاملہ زیادہ گمبھیر تھا۔

اسرائیل کے بہت سے معتدل بلکہ سخت گیر پالیسی کے حامی بھی مقبوضہ زمین کے بدلے امن کے حصول میں متذبذب ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ علاقوں کی واپسی تو مستقل ہوگی لیکن امن پائیدار نہیں ہوگا۔ بین الاقوامی ضمانتوں پر انہیں اعتماد کم ہے کیونکہ ۱۹۴۸ اور ۱۹۵۶ کی جنگوں کے بعد فراہم کردہ ضمانتیں کسی بھی بحران کے پیدا ہوتے ہی ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ ان کا یقین ہے کہ کسی بھی پائیدار سمجھوتے کے لئے محض باہمی اعتماد پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا اور ان کی یہ بات بس ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ ایسا کوئی باہمی اعتماد پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا اور ان کی یہ بات بس ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ ایسا کوئی باہمی اعتماد محض کسی معاہدہ کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتا البتہ صرف متصادم فریقوں کے درمیان امن قائم کر سکتا ہے۔ امن کی بنیاد سلامتی کے مضبوط انتظامات اور طاقت کے توازن پر رکھی جانی چاہئے۔ عسکری قوت کے بل پر قائم ہونے والا امن خود بھی مضبوط ہوتا ہے جبکہ باہمی اعتماد کی بنیاد پر قائم ہونے والا امن اعتماد ختم ہو جانے پر غائب ہو جاتا ہے۔ ہاں' قوت پر بھروسہ کرنے والا امن برقرار رہتا ہے چاہے باہمی اعتماد ختم ہو چکا ہو۔ (جاری ہے)

ایک بنیان مرصوص جماعت بنائی، ایک پرچم تلے لاکھوں نوجوانوں کو جمع کر لیا اور قربانی کا وہ جذبہ پیدا کیا جو یقیناً مثالی ہے۔ یہی جذبہ اگر اسلام کے نفاذ کے لئے پیدا کرتے تو ملک کی تقدیر بدل جاتی، کراچی ہراول دستے کا رول ادا کر سکتا تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام علمائے کرام کے کرنے کا تھا۔ وہ مسجد و محراب اور مدرسہ کی چار دیواری سے نہ نکل سکے اور جو نکلے بھی وہ وقت کے سیاسی دھارے میں شامل ہو کر "عزت سادات" بھی گنوا بیٹھے۔ ہمارا دین، دین پاپائیت نہیں ہے، اس میں طبقاتی تقسیم بھی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کو اس پیشے سے متعلق کر دیا گیا ہو اور باقی اس سے آزاد ہوں۔ یہ صورت دور ملوکیت اور دور غلامی میں پیدا ہوتی ہے جو نہ محمود ہے نہ مطلوب۔ جس نے بھی اس دین کو اختیار کیا ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ اسے زندگی کے ہر شعبے میں اختیار کرے۔ یہ زندہ دین ہے، اس کی گرفت میں زندگی کے تمام شعبے آتے ہیں۔ ہر شخص اس کے لئے مسئول ہے اور ہر شخص پر اس کی ذمہ داری ہے۔ دین و دنیا کی تقسیم نے ہمیں رسوا کیا ہے اور اسی تقسیم کی وجہ سے ذلت و خواری مقدر بنی ہے۔

ہمیں اس صورت حال سے نکلنا ہو گا۔ اپنے نوجوانوں کو بتانا ہو گا کہ زندگی کا مقصد محض "حصول حقوق" نہیں۔ اپنے اس دین کو جس میں تمام مسائل کا حل ہے اپنی اس سرزمین پر نافذ کرو تو تمہیں حقوق بھی ملیں گے اور تم دنیا و آخرت میں سرفراز بھی ہو گے۔ اس مقصد کے لئے آگے بڑھو، اس کے لئے جدوجہد کرو، اس کے لئے بنیان مرصوص بنو اور پھر دیکھو تمہارے حقوق تمہارے قدموں میں کس طرح آتے ہیں OO

کراچی میں نو آزاد روسی ریاستوں کی خواتین کی اٹھکیلیاں

ـــ میم سین ـــ

پاکستان بدقسمتی سے اب تک ایک اسلامی مملکت نہ بن سکا کہ ہم نے اسلام کا نام تو بہت لیا لیکن عملی مسلمان نہ انفرادی طور پر بن سکے اور نہ اجتماعی طور پر اس جانب کوئی پیشرفت کی۔ آج بھی صورتحال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت پر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بالادستی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ لوگوں کو مادر پدر آزادی حاصل ہو جائے۔ ہم بہرحال مسلمان ہیں اور مسلمانوں پر مشتمل حکومت کا فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے سے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہو۔ تمام ذرائع ابلاغ کا فرض تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ نیکی کی ترویج کرتے اور تمام مقتدر اداروں کا فرض تھا کہ وہ برائی کو طاقت کے ذریعہ کچل ڈالتے لیکن صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک طرف حکومتی کنٹرول میں چلنے والے اداروں نے منظم طور پر عریانی اور فحاشی کے فروغ کو اپنا ہدف بنا لیا ہے تو دوسری جانب تمام مقتدر اداروں نے برائی کے سدباب سے چشم پوشی اختیار کر لی ہے۔ عورتوں کی چلتی پھرتی، اچھلتی کودتی اور ناچتی گاتی تصاویر ٹیلیویژن کے پروگراموں کی زینت بنتی رہتی ہیں اب نیکر اور اسکرٹس میں ملبوس بے حیا خواتین جو روس کے تسلط سے آزاد شدہ جمہوریاؤں سے یہاں کاروبار کے لئے آئی ہوئی ہیں، آزاد چھوڑ دی گئی ہیں۔ شہر کے مصروف بازاروں میں یہ عورتیں گھومتی پھرتی رہتی ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات انتہائی قابل اعتراض ہیں جن کو مسلم معاشرہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا حکومت کا کوئی مقتدر ادارہ ایسا ہے کہ انہیں لگام ڈالے اس سے پہلے کہ ہمارے فیشن زدہ حلقوں میں ان کے طور اطوار بھی شامل ہو جائیں؟

ڈاکٹر اسرار احمد
امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان
کی تازہ ترین تالیف
برعظیم پاک و ہند میں
اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل
اور اس سے انحراف کی راہیں
شائع ہو گئی ہے ـــ جس میں
- اسلام کے ابتدائی انقلابی فکر اور اس میں زوال کی تاریخ کے جائزے کے بعد
- علامہ اقبال کے ذریعے اس کی تجدید اور مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے ہاتھوں اس کی تعمیل کی مساعی اور ان کے حاصل، اور
- "اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں ناگزیر تدریج اور اس کے تقاضوں" کے علاوہ
- اس فکر سے انحراف کی بعض صورتوں پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے ـــــ!

سفید کاغذ پر ۱۰۴ صفحات، مع دیدہ زیب ارڈ کور ـــ قیمت فی نسخہ /۳۰

بقیہ: پریس ریلیز

جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ امت مسلمہ کو یہ امتحان درپیش ہے کہ ختم نبوت کے بعد وہ اللہ کے بندوں کو اس کا دین پہنچانے کا فرض ادا کرتے ہیں یا نہیں، جس میں عرب تو ناکام ہو کر اغیار کے شکنجے میں جکڑے جا چکے ہیں، اگلی باری ہماری ہے، کیونکہ ہم نے بھی پاکستان کو اللہ تعالیٰ سے اسلام کا نمونہ بنانے کے لئے مانگا تھا۔ اب ہم امتحان کے عرصہ محشر میں ہیں جس میں سرخروئی کے حصول کے لئے ہمیں ملک خداداد کو اسلام کے نظام عدل و قسط کے ماڈل کے طور پر پیش کر کے پوری دنیا پر حجت تمام کرنی ہے۔ اس مشن میں ہم اسی طرح ناکام رہے جیسے اب تک ہیں تو پاکستان کے وجود کا کوئی جواز نہ رہے گا اور ویسے بھی پاکستان کو نہ تاریخ کی پشت پناہی حاصل ہے نہ جغرافیہ کا تحفظ، جبکہ کوئی نسلی، لسانی اور تہذیبی تقدس بھی اس کی یکجائی کے لئے میسر نہیں ہے اور صرف اسلام ہی وہ رشتہ ہے جو اس کی آبادی کو متحد رکھ سکتا ہے۔ OO

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

پریس ریلیز

خلیل اللہ ؑ کی پوری زندگی کا جامع عنوان "امتحان" ہے

پاکستان کے مسلمان بھی ایک کڑے امتحان سے گزر رہے ہیں' افراد کے امتحان کا نتیجہ آخرت میں نکلتا ہے لیکن قوموں کو اسی دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے

ڈاکٹر اسرار احمد نے دعویٰ کیا کہ تقسیم کے سوا سندھ کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں

لاہور ۔ ۱۳ / مئی : امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت ڈاکٹر اسرار احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ سندھ کے مسئلے کا صوبے کی تقسیم کے سوا کوئی حل نہیں' اور کوئی ہے تو سامنے لایا جائے' کیونکہ اسے فوج کے حوالے کئے رکھنا وہاں نیم مارشل لاء کا تسلسل ہے جس کی وکالت جمہوریت کے دعویداروں کو زیب نہیں دیتی۔ مسجد دارالسلام باغ جناح کے خطاب جمعہ میں انہوں نے کہا کہ کراچی کی اتنی بڑی آبادی کو دیوار سے لگا کر رکھنے میں ملک و قوم کا مفاد ہرگز نہیں' جو پاکستان پر اس کے دوسرے شہریوں سے کم حق نہیں رکھتی۔ ایم کیو ایم حقیقی کے چیئرمین آفاق احمد کے انتباہ کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ واشنگٹن پلان محض کوئی واہمہ نہیں ہے۔ ان کی یہ اطلاعات بالکل درست نہ بھی ہوں کہ کئی امریکی کمپنیوں کو کراچی کی بندرگاہ کے متعدد اہم ترین حصے لیز پر دے دیئے گئے ہیں اور امریکی بینکوں کی کراچی میں موجود شاخوں میں دہشت گردوں کے اکاؤنٹ چل رہے ہیں تب بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کو ایک نئے ہانگ کانگ کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے' چنانچہ ایم کیو ایم کے لیڈروں سے امریکی سفارتی عملے کے روابط بڑھتے چلے جا رہے ہیں' جن پر اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت پاکستان نے احتجاج بھی کیا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ان بین الاقوامی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سندھ میں آباد مہاجروں کو مطمئن کرنا ضروری ہے جو صوبائی سطح پر ان کے معاملات خود انہی کے ہاتھوں میں دیئے بغیر ممکن نہیں اور اس کے لئے صوبے کی تقسیم لازم ہے۔ تاہم تقسیم کا فارمولا صرف سندھ پر استعمال ہوا اور پنجاب کو بھی لسانی ثقافتی بنیادوں پر اس کے تقریباً مساوی ٹکڑوں میں تقسیم نہ کیا گیا تو سندھی اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مشرقی پنجاب ہمارے مغربی پنجاب سے رقبے میں پہلے ہی چھوٹا تھا لیکن اسے بھی ایک عرصہ پہلے تین صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس سے بھارت کی سالمیت پر آج تک کوئی آنچ نہیں آئی۔ انہوں نے کہا کہ صوبوں کی تقسیم اور صدارتی نظام کے حق میں میری حمایت دینی اصولوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی حکمت عملی کا تقاضا ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور کتاب و سنت کی مکمل بالادستی کے تحت حکومت کا کوئی بھی بندوبست اسلام میں مباح ہے۔ میرے نزدیک اگرچہ صدارتی نظام خلافت کے نظام سے قریب تر ہے تاہم پارلیمانی نظام کی خرابیوں کا کوئی علاج نکال لیا جائے تو وہ بھی خلافت کی ضد نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس اعتراض کے جواب میں کہ "پارلیمانی نظام انگریز کی وراثت ہے تو صدارتی نظام بھی امریکہ کا عطیہ ہے" کہا کہ پھر یہ بھی تو دیکھا جانا چاہئے کہ انگریز کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا اور امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور ہے۔ انہوں نے کہا کہ پارلیمانی نظام میں قوت کے دو مراکز صدر اور وزیر اعظم کے نام سے وجود میں آ جاتے ہیں جن کے درمیان اختیارات کی تقسیم میں توازن برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہے' جبکہ توحید کے حق میں قرآن مجید میں ایک دلیل یہ بیان ہوئی ہے کہ خدائی اختیارات رکھنے والے معبود اگر دو ہوتے تو کائنات فساد سے بھر کر رہ جاتی۔ صدارتی نظام کے جواز میں ایک دلیل کے طور پر ڈاکٹر اسرار احمد نے مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کے اصول کا ذکر کیا جسے اب ایک عصری تقاضے کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور جو صدارتی نظام حکومت میں ہی ممکن ہے' جبکہ پارلیمانی نظام میں مقننہ اور انتظامیہ ہمیشہ گڈ مڈ رہتی ہے۔

قبل ازیں ڈاکٹر اسرار احمد نے حج اور قربانی کے شعائر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ اللہ کے خلیل' ابوالانبیاء اور امام الناس ابراہیم علیہ السلام کی مثالی زندگی کے نقوش ہیں جو شروع سے آخر تک کڑے امتحان سے عبارت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اپنی طویل اور ابدی زندگی کا وہ مختصر حصہ جو ہم دنیا میں گزارتے ہیں دراصل ایک امتحان ہے جس سے افراد اور قوموں دونوں کو گزرنا پڑتا ہے' البتہ فرق یہ ہے کہ افراد کے امتحان کا آخری نتیجہ آخرت میں نکلتا ہے جبکہ اقوام کے امتحان کے پورے نتائج اسی دنیا میں ظاہر کر دیئے

(باقی اندرونی سرورق کے دوسری جانب)